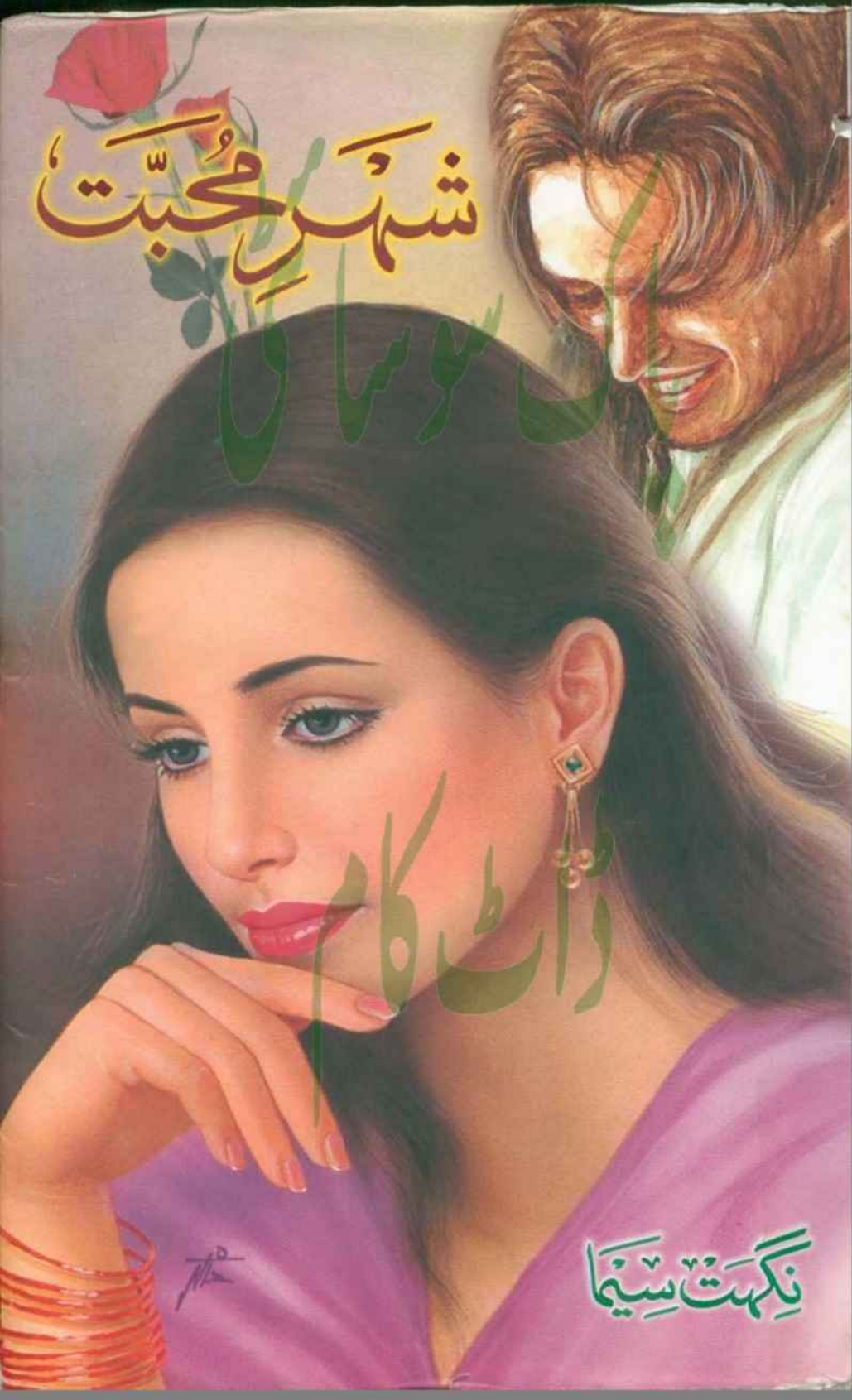


شہرِ محبت



نگہت سیمّا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی شہرِ محبت

نگہتِ سیما

ڈاٹ کام

المجاہد پبلیشرز

0321-6450283
0300-6450283
055-8204177

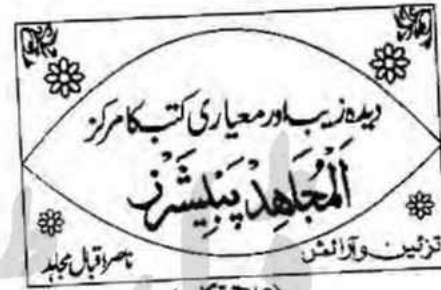
4 منزل دین پلازہ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

- ✽ ملت بک شاپ، فیصل مسجد اسلام آباد
- ✽ مکتبہ معارف اسلامی، منصورہ، ملتان روڈ لاہور
- ✽ مکتبہ انجمن تبلیغ اسلام، الاکرام بلڈنگ راولپنڈی
- ✽ علم و عرفان پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
- ✽ الہدٰی کتب گھر، کچہری روڈ گجرات
- ✽ مکتبہ اذان سحر، منصورہ لاہور
- ✽ خزینہ علم و ادب، اردو بازار لاہور
- ✽ حق پبلی کیشنز، چیمبرجی روڈ لاہور
- ✽ احمد بک ڈپو، گوجرانوالہ
- ✽ اجالا بک سنٹر، اردو بازار، گوجرانوالہ
- ✽ علی میاں پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
- ✽ بک کارنر، شوروم، بالتقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ، جہلم
- ✽ ادارہ طبوعات طلبہ، چھوڑا لاہور

اختصاصیہ

ان محبتوں کے نام
جو ناپید ہو چکی ہیں



(ملاحظہ)

شہر محبت	✽ نام کتاب:
نگہت سیما	✽ نام مصنفہ:
جون 2009ء	✽ اشاعت:
محمد امجد	✽ کمپوزنگ:
250 روپے	✽ قیمت:

پاک سوسائٹی

پیش لفظ

”شہر محبت“ اور دیگر ناولٹ اب کتابی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھے گئے یہ ناولٹ یقیناً آپ کو پسند آئیں گے۔

”ذرا نرم ہو تو یہ مٹی“ اس کہانی میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اپنی نسل سے مایوس نہیں ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی چنگاری ضرور دہنی ہوئی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ غلطیاں جو بڑوں سے سرزد ہوئی ہیں۔ نئی نسل بھی انہیں دہرائے۔ میری کہانیوں کے کردار اسی زمین پر رہنے بسنے والے کردار ہیں۔ اپنی زندگی کے اس سارے ادبی سفر میں میں نے بے شمار کہانیاں اور ناولٹ لکھے ہیں جنہیں بہت پذیرائی ملی ہے۔ میرے لیے اپنے قارئین کی یہ پذیرائی بہت اہمیت رکھتی ہے۔

نیک دعاؤں کے ساتھ

نکمت سیما

15 اپریل 2009ء

شہر محبت

”تم کیا سمجھتی ہو رومی کو، اپنی غلام۔۔۔ محکوم۔۔۔ نوکر، تو اچھی طرح سن لو تو کر وہ نہیں تم ہو اس کی اور خبردار آئندہ کبھی رومی کے کسی معاملے میں دخل دیا تو، یا اسے بلا وجہ ٹوکا۔“

مما اپنے لفظوں کی ہلاکت خیزیوں سے بے خبر رومی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور رومی جوان کی اچانک آمد پر ہکا بکا کھڑی تھی کچھ کہنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی ان کے ساتھ ہی گھسی چلی گئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں یونہی خالی خالی ذہن کے ساتھ کھلے دروازے کو دیکھتی رہی تھی یہ کیا ہوا ہے؟ یہ ممانے کیا کہا ہے؟ میں ممانے کے جانے کے ایک گھنٹے بعد ان کے کہے لفظوں کو معنی پہنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ماما میری سوتیلی ماں ہیں؟“ بہت دن پہلے ایک بار آیا ہوا خیال آج بھر پوری شدت کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔

”لیکن اگر ایسا ہے بھی تو کون مجھے بتائے گا کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا بیا مجھے بتائیں گی کہ حقیقت کیا ہے اور حقیقت تو صرف بیا ہی بتا سکتی ہیں لیکن بیا کہتی ہیں ایسا نہیں ہے تم جیا کی بیٹی ہو۔ جیا کی شادی کے آٹھ سال بعد تم پیدا ہوئی تھیں۔ میری آنکھیں بے تحاشہ جل رہی تھیں۔“

بیانے مجھے بتایا۔ ”جیا کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے تھے اور جب وہ مایوس ہو گئی تو تم آگئیں خدا کا تحفہ اور میرے پانچ سال بعد رومی اور ریان۔“

پانچ سال کی عمر کی باتیں یا تو نہیں رہتیں اور مجھے بھی کچھ زیادہ یاد نہیں ہے لیکن وہ دن میرے حافظے میں بالکل اس طرح موجود ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ میں پاپا کے ساتھ ہاسٹل آئی تھی اور پاپا نے مجھے راستے میں بتایا تھا کہ ہم ماما اور ماما کے ساتھ گڑیا سی بہن کو اور بھائی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔

”یہ بھائی بہن کہاں ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ اللہ میاں نے تمہارے لیے بھیجے ہیں۔“

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک زمین پھٹ جائے یا آسمان آگرے یا پھر کوئی بڑا حادثہ ہو تو یہ سمجھ میں ہی نہ آئے کہ کیا ہوا ہے، تو مجھے بھی اس سے ایسا ہی لگا تھا کہ شاید آسمان گر گیا ہے یا زمین پھٹ گئی ہے یا پھر پہاڑ نہیں کیا ہوا؟

کتنی ہی دیر تک میں نا سمجھی سے اس کھلے دروازے کو دیکھتی رہی جس سے ابھی ابھی ماما نکل کر گئی تھی اور ان کے پیچھے رومی مجھے بے بسی سے ہنسی ہوئی گویا ان کے پیچھے گھسی جا رہی تھی کیونکہ ممانے اس کا بازو سختی سے تھام رکھا تھا اور وہ کچھ کہنے کی کوشش میں بار بار ہونٹ کھول اور بند کر رہی تھی اور ممانے کے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں ان الفاظ کو معنی پہنانے کی کوشش کر رہی تھی جو ممانے میرے لیے کہے تھے۔

”تمہیں رومی کو اس بری طرح ڈانٹنے اور خفا ہونے کا حق کس نے دیا ہے اور کیوں ڈانٹ رہی ہو تم اسے؟“

”پہا نہیں ماما آج اتنے غصے میں کیوں ہیں؟“

میں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا تھا اور میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ رومی میری بہن ہے اور مجھے یہ حق ہے کہ میں اسے کوئی غلط کام کرتے دیکھوں تو ڈانٹوں اور منع کروں لیکن ماما کے اگلے جملے نے میری قوت گویائی یکدم سلب کر لی۔

”پھر اللہ میاں نے انہیں ہمارے گھر کیوں نہیں بھیجا ہسپتال کیوں بھیجا ہے۔“

”ہم انہیں گھر ہی تو لینے جا رہے ہیں۔“

پاپا نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ میں اگر چہ چھوٹی سی تھی لیکن سوال کر کر کے ناک میں دم کر دیتی تھی۔ ہر بات کو جاننے کا تجسس تھا میری نچر میں۔

پھر ہسپتال کے ایک کمرے میں ماما کے بند کے ساتھ پڑی کاٹ میں سے بیانے اس ننھی سی گڑیا کو اٹھا کر مجھے دکھایا تھا۔

”سوی دیکھو، یہ اللہ نے تمہارے لیے ایک بہن بھیجی ہے۔“

چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی منھیاں بند کیے وہ آنکھیں بند کیے سو رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا پھر فوراً ہی اٹھالیا تھا۔

یہ ساری باتیں اس لیے بھی میرے ذہن میں رہ گئیں کہ بیا وقتاً فوقتاً انہیں دہراتی رہتی تھیں۔

”بہنا کو پیار کرو سوی۔“ بیانے مجھے کہا اور میں نے ڈرتے ڈرتے ہی اس کے نرم نرم گلابی رخساروں پر پیار کیا۔ گو مجھے اس سے تھوڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی اور میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے؟“

”کون؟“ بیانے پوچھا تھا۔

”وہ بھائی، پاپا نے کہا تھا کہ فرشتے ایک بھائی بھی لائے ہیں۔“

بیاسکرائی تھیں۔

”اس کی طبیعت خراب ہے اس لیے اسے آسپین باکس میں رکھا ہوا ہے۔“

اور پھر پاپا نے مجھے ششے میں سے اسے دکھایا تھا، وہ بہت کمزور اور چھوٹا سا تھا۔

اور پھر ماما گھر آ گئیں، ریان اور رومی دونوں کو لے کر۔ ریان بہت

کمزور تھا اور کچھ بیمار بھی تھا اس لئے ماما سے گود میں لے کر بیٹھی رہتی تھیں اور رومی کو بیا ہی

سنجالتی تھی۔

میرا جج سکول جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ منہ بسورتی ہوئی سکول جاتی تھی اور آتے ہی بیک بچینک کر بیا کے کمرے کی طرف بھاگتی۔ رومی کبھی سوئی ہوئی کبھی جاگ رہی ہوتی۔ میں اسے خوب پیار کرتی۔

رومی کو زیادہ تربیاتی سنبھالتی تھیں، بیا ماما کی بڑی بہن اور بیا کی چچا زاد بہن تھیں اس بڑے سے گھر کے دو پورشن تھے ایک پورشن میں بیا اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے دوسرے پورشن میں ان کے چچا رہتے تھے جن کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی رابعہ جنہیں ممانے بچپن میں بیا کہا کر بلایا تو پھر سب ہی انہیں بیا کہہ کر بلانے لگے اور دوسری وجیہ حسن کی شادی بیا سے ہوئی تھی اور جو بیا سے سات سال چھوٹی تھیں۔

بیا شادی کے چند ماہ بعد ہی بیوہ ہو کر واپس اسی گھر آ گئی تھی اور پھر انہوں نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔ نجیب ماموں اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں سیٹل تھے اور یہاں اسی گھر میں بیا اکیلی رہتی تھیں۔ میں اور رومی ماما کی نسبت بیا سے زیادہ قریب رہے تھے اور اپنی ہر بات ماما کی بجائے بیا سے ہی کرتے تھے اور بیا بھی ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ماما ہر وقت ریان کی فکر میں ہی رہتی تھیں، وہ بہت کمزور بھی تھا اور بیا نے بتایا تھا کہ اسکے دل میں چھوٹا سا سوراخ بھی ہے۔

مما ریان کے سلسلے میں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتی تھیں۔ کئی بار میں ماما کے کمرے میں گئی تھی اور چاہا تھا کہ ماما، بیا کی طرح اسے پیک کر کے میری گود میں لٹا دیں لیکن ماما کو مجھ پر ذرا بھروسہ نہ تھا انہیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں میں اسے گرانہ دوں حالانکہ بیانے دو ایک بار میری سفارش بھی کی تھی۔

یوں میں ریان کی نسبت رومی کے زیادہ قریب تھی اور رومی تو جیسے میری دیوانی تھی، میرا سایہ۔ اس نے ہمیشہ وہی کیا جو میں نے کیا جو نوڈ مجھے پسند تھا وہی اس کی پسند تھی جو

”تمہارا بھائی بہت پیارا ہے۔“

منچر نے کہا تو میں نے بڑا غر محسوس کیا۔ بریک ہوتے ہی میں تیر کی طرح اس کی کلاس میں گئی تھی اس کی انگلی پکڑ کر اسے اپنی کلاس میں لے آئی تھی رومی تو خود ہی بریک ٹائم میں آ جاتی تھی میں نے ماما کی طرح لقمے بیٹا کر اس کے منہ میں ڈالے تھے اور پھر ہم تینوں لچ کر کے باہر آ گئے تھے اور ایک طرف کھڑے ہو کر بچوں کو کھیلنے دیکھنے لگے تھے میں نے ریان کو جھولے میں بھی بٹھایا تھا۔ اس روز مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے من میں چھپی کوئی حسرت اچانک پوری ہو گئی ہو میں نے اور رومی نے بریک میں ریان کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں لیکن ریان بہت کم بولتا تھا اور بریک کے بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ میں اور رومی اسے کلاس میں چھوڑ کر آئیں تھیں۔ اس روز گھر آ کر بھی میں اور رومی ریان کی باتیں کر رہے تھے ہوں ہی چھوٹی چھوٹی لائینی باتیں مثلاً یہ کہ ریان کی منچر اچھی ہیں۔ ریان کی کلاس میں وہ گلابی گلابی سی بچی بہت کیوٹ ہے جو سب سے آگے بیٹھی تھی۔ اس دن گھر میں جتنی بار بھی ریان سے سامنا ہوا وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا دیا جو بابا ہم بھی مسکرا دیے اس شام ماما سے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

”ماما میں ریان کو ہوم ورک کروادوں۔“

ماما اس وقت ٹی وی لاؤنج میں کھڑی بیا سے کوئی بات کر رہی تھیں، انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھ کر سر ہلا دیا۔ اس روز مجھے یہ دوسری خوشی ملی تھی سات سال سے میں اور رومی ہی ایک دوسرے کے دوست تھے ریان ہمیشہ ہم سے دور ماما کے پاس ہی رہا تھا۔ ماما کے اجازت دینے کے بعد میں بھاگی ہوئی ماما کے کمرے میں گئی تھی اور ریان کا بیک کنڈسے پر لٹکا کر اور ریان کا ہاتھ یوں احتیاط سے تھام کر اپنے کمرے میں لائی تھی جیسے وہ کانچ کا گڈا ہو۔ رومی اپنے بیڈ پر بیٹھی رنگین تصویروں والی بک دیکھ رہی تھی۔ میرے ساتھ ریان کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیران ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی سنہری آنکھیں چمکنے لگیں تھیں وہ بھی ریان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

کلرز اور ڈریس مجھے پسند تھے وہ بھی وہی کلرز پہنتی تھی حالانکہ ماما اس بات پر خاصا چڑتی تھیں۔ وہ جیسے میرے نقش قدم پر پاؤں رکھتی آرہی تھی۔

شروع شروع میں ہم دونوں نے ریان سے بھی قریب ہونے کی کوشش کی تھی اور ہم چاہتے تھے اپنے ہر کھیل میں اسے بھی اپنے ساتھ رکھیں لیکن ماما نے ریان کو کبھی ہمارے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ ریان کو ہم سے یوں دور رکھتی تھیں جیسے ہمیں کوئی جراثیم چنے ہوئے ہوں۔ وہ ہمیشہ ریان کے ساتھ رہتی تھیں ریان ان کے بیڈ روم میں ہی سوتا تھا جبکہ رومی بیا کے پاس سوتی تھی لیکن جب وہ چھ سال کی ہوئی تو وہ ضد کر کے میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ بیا اسے اٹھا کر لے جاتیں اور کبھی وہ یہاں ہی سوئی رہتی۔

رومی نے میری طرح تین سال کی عمر میں نرسری میں جانا شروع کر دیا تھا جبکہ ریان کو ماما نے سکول نہیں بھیجا تھا۔ وہ ابھی تک بہت کمزور سا تھا۔ ماما خود اسے بلا کس وغیرہ سے سکھاتی تھیں جبکہ رومی میرے ساتھ سکول جاتی تھی، جب تک وہ نرسری پرپ میں رہی اسے جلدی چھٹی ہو جاتی تھی اور ڈرائیور اسے لے جاتا تھا۔ وہ ہر پیرڈے میں میرے پاس بھاگی آتی تھی اور پھر میں اسے دوبارہ اس کی کلاس میں چھوڑ کر آتی تھی رومی جب کلاس ٹو میں آئی تو ماما نے ریان کو گھر ہی میں تیاری کروا کے سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ جس روز ماما نے ریان کو سکول میں داخل کروایا مجھے اپنے پاس بلا کر کہا تھا۔

”دیکھو سومی! تم بڑی ہو، ریان کمزور اور بیمار ہے اور یہاں سکول میں تمہیں ہی اس کا خیال رکھنا ہے بریک میں اسے اپنے ساتھ رکھنا اور بھاگ دوڑ مت کرنے دینا۔“

میں تب ساتویں جماعت میں تھی اور ماما کا مجھے اس طرح ریان کا خیال رکھنے کا کہنا بہت اچھا لگا اور اپنا آپ بڑا معتبر سالگا اور میرے اندر خوشی کی انجانی سی کلیاں چٹکنے لگی تھیں۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریان کی کلاس میں جاتی تھی اور اس کی طبیعت پوچھتی تھی۔

”تم ٹھیک ہوتا، کوئی چیز تو نہیں چاہیے، پانی پینا ہے، واش روم میں جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرا دیتا اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

”ممانے کہا ہے میں ریان کو ہوم ورک کروادوں۔“ میں نے خوش ہو کر رومی کو بتایا اور اسے اپنے بیڈ پر بٹھا کر بہت اٹھماک سے ہوم ورک کروایا۔

اس نے ہوم ورک ختم ہی کیا تھا کہ ممانے لینے آگئیں۔

”ریان تم ٹھیک ہو بیٹا تھک تو نہیں گئے چندا؟“ ممانے بے چینی سے پوچھا اور ریان نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”مما کیا اب ریان ٹھیک ہو گیا ہے؟ کیا اب وہ روز سکول جائے گا؟“

رومی نے پوچھا تھا اور ممانے سر ہلا کر چلی گئی تھیں۔ اس رات میں نے بڑے خوبصورت خواب دیکھے تھے ممانے، پاپا، ریان، رومی، ماما اور میں ساری رات خوابوں میں خوبصورت باغوں میں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومتے پھرے تھے۔

ریان کو جلدی تھک جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی رہتی تھی لیکن وہ باقاعدگی سے سکول جاتا تھا اور پہلے روز کی طرح میں اس کا خیال رکھتی تھی۔ گھر آ کر ہوم ورک کرواتی تھی یہ سال میرے لیے بڑا خوشگوار تھا۔ اس ایک سال میں میں بہت خوش رہی تھی بیا بھی کہتی تھیں کہ میں اب بہت کم سوال کرتی ہوں ورنہ پہلے تو سوال کر کر کے ان کا ناک میں دم کر دیتی تھی اور اس پورے سال میں ایک بار بھی میں نے بیا سے ماما کی کوئی شکایت نہیں کی ورنہ دس چدرہ دن بعد میں بیا سے ضرور کہتی تھی۔

”بیا ماما مجھ سے پیار سے نہیں کرتی بالکل بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں ماما کی سگی بیٹی نہیں ہوں وہ میری Step Mother ہیں۔ ہیں ناں بیا! آپ کو بھی ایسا لگتا ہے ناں؟“ اور بیا پیار سے میرا رخسار چھو کر کہتی۔ ”تم بالکل پاگل ہو سوسی! جیسا پریشان رہتی ہے ریان کی طرف سے اور اس کا دھیان ہر وقت اسی کی طرف لگا رہتا ہے نا۔“

لیکن بیا کے سمجھانے کے باوجود چپا نہیں کیوں میرا دل سمجھتا ہی نہ تھا۔

”کیا تھا بیا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ماما کے بجائے آپ کی بیٹی بنا دیتا۔“

”اب بھی تو تم میری بیٹی ہونا!“

بیا مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتیں۔

”ہاں وہ تو ہے لیکن“

میں پھر کوئی بات ڈھونڈ لیتی پتا نہیں میں کیا چاہتی تھی لیکن اس ایک سال میں تو میں اتنی مگن رہی تھی کہ میں نے بیا سے ایک بار بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمارا زلٹ آ گیا تھا میں اور رومی اپنی اپنی کلاس میں فرسٹ آئے تھے اور ریان سکیٹھ آیا تھا۔ اب وہ ٹو میں رومی تھری میں اور میں آٹھویں میں آگئی تھی۔ ریان کی کامیابی پر ممانے مجھے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ریان کی کامیابی کا سہرا سوسی کے سر ہے۔ سوسی نے اس کے ساتھ بہت محنت کی ہے۔“

اس روز ممانے رومی اور ریان کے ساتھ مجھے بھی گلے لگا کر میری پیشانی چومی تھی اور بیا اپنے ساتھ ہمیں گھمانے لے گئے تھے۔ ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔ کے ایف سی کا چکن کھایا تھا اور پیسی پی تھی اور ریان کے اصرار پر بیٹھے پان بھی کھائے تھے۔

رات کو بیڈ پر لیٹتے ہوئے میں نے یہ عہد کیا تھا کہ اب کبھی میں ماما کی بیا سے شکایت نہیں کروں گی، بیا سچ کہتی ہیں کہ ماما میری اپنی اصلی والی ماما ہیں، بس ریان اور رومی چھوٹے ہیں نا اس لیے ماما ان سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ ممانے مجھے کبھی مارا نہیں تھا ڈانٹا نہیں تھا۔ میرے اور رومی کے ڈراموں کا ایک ہی شاپ سے آتے تھے، ہم ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے گھر میں بھی کوئی ایسا امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا پھر بھی جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ماما مجھ سے اتنا اور اس طرح پیار نہیں کرتی جس طرح اور ہوتا وہ رومی اور ریان سے کرتی ہیں لیکن اس رات اپنی پیشانی کو انگلی سے چھو کر ماما کے ہونٹوں کے لمس کو کتنی ہی بار اپنی پیشانی پر محسوس کرتے ہوئے میں نے اعتراف کیا تھا کہ ماما کو مجھ سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا رومی اور ریان سے۔ اس رات میں خوشیوں کے پنڈولے میں جمجھکی گھری نیند میں کھو گئی تھی لیکن شاید میری خوشیوں کو خود میری نظر لگ گئی تھی صبح چار بجے

کے قریب بیانے میرے دروازے پر دستک دی تھی اور ساتھ ہی بلایا تھا۔

”سوئی۔۔۔ سوئی بیٹا دروازہ کھولو۔“

میں نے سمجھا تھا شاید صبح ہو گئی ہے میں آج دیر تک سوئی رہی ہوں اور بیا کو مجھے

جگانا پڑا ہے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا بیا پریشان سی کھڑی تھی۔

”سوئی رات سے ریان کی طبیعت بہت خراب ہے اسے سانس لینے میں تکلیف

ہو رہی ہے ہم ریان کو ہاسپٹل لے کر جا رہے ہیں جیناں کو میں نے کہہ دیا ہے وہ اپنے کوارٹر

سے آ کر ادھر لاؤنچ میں لیٹ گئی ہے۔ بھائی کے لیے دعا کرنا ابھی سو جاؤ صبح ناشتہ کر لیتا۔“

میں پریشان سی ہو کر باہر نکل آئی۔ مماری طرح روری تھیں اور بیانے ریان کو

اٹھایا ہوا تھا میرے آنسو بہنے لگے میں ماما سے لپٹ گئی۔

”ماما میں بھی چلوں گی۔“ ماما نے آنکھوں سے مجھے الگ کر دیا۔

”بیانے آپ سے کہا بھی تھا اس وقت اسے مت جگاؤ صبح اٹھے گی تو جیناں

بتا دے گی اسے۔“

بیانے مجھے سمجھایا کہ میں جا کر اپنے کمرے میں سو جاؤں لیکن میں وہاں ہی کھڑی

رہی جب تک وہ سب باہر نہ چلے گئے اور جیناں لاؤنچ کا دروازہ بند کر کے کارپٹ پر لیٹ

گئی پھر صبح تک مجھے نیند نہ آئی۔

”یا اللہ ریان کو کچھ نہ ہو۔“ میں مسلسل دعا کر رہی تھی اور پھر ریان اگلے دن تک

ہاسپٹل میں رہا۔ ماما مسلسل اس کے پاس تھیں بیا کبھی کبھہ دیر کو دن گھر آ جاتیں تھیں لیکن

رات کو وہ گھر پر ہی رہتی تھیں میں نے بیا سے بہت ضد کی تھی کہ وہ ہمیں ہاسپٹل لے چلیں ہم

نے بھی ریان کو دیکھنا ہے اور پاپا بہت معروف تھے اور پھر ریان اور ماما گھر آ گئے لیکن ریان

اور بھی کمزور ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے جلتے پڑ گئے تھے۔ بیانے ہمیں بتایا تھا کہ ماما

اور پاپا ریان کو انگلینڈ لے کر جا رہے ہیں وہاں اس کا آپریشن ہوگا۔

”کیا یہاں یہ آپریشن نہیں ہو سکتا بیا؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”ہو تو سکتا ہے لیکن وہاں زیادہ ماہر ڈاکٹر ہیں ناں جیا یہاں آپریشن کرواتے

ہوئے ڈرتی ہے اور سچ بھی ہے یہاں ڈاکٹر آپریشن تو کر لیتے ہیں لیکن آپریشن کے بعد کوئی

احتیاطی تدابیر نہ خود اختیار کرتے ہیں اور نہ بتاتے ہیں۔“

پھر سب تیاریاں مکمل ہو گئیں یہاں تک کہ ان کا انگلینڈ جانے کا دن آ گیا اس

دوران ریان کا دو تین بار سانس اکڑ گیا تھا اور اسے ہاسپٹل لے جانا پڑا تھا لیکن پھر ایک دو

روز بعد وہ گھر آ گئے تھے۔

جس روز ماما پاپا اور ریان نے جانا تھا میں اور رومی نے بیا سے کہہ کر سکول سے

چھٹی کر لی تھی اور بیا کے ساتھ ایئر پورٹ پر گئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے ماما

نے بیا سے مل کر رومی کو پیار کیا اور بھائی کے لیے دعا کرتے رہتا تو کہا تھا لیکن وہ میرے پاس

نہیں آئی تھی اور نہ ہی انہوں نے مجھے کچھ کہا تھا حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مجھے بھی اس

طرح پیار کریں اور تب بیانے مجھے اپنے ساتھ لگا کر میری پیشانی چومی تھی۔ دایاں ہاتھ

میرے گرد حائل کئے ہوئے بائیں ہاتھ سے انہوں نے میرے رخسار پر ہتھے آنسو پونچھے

تھے۔

”روتا نہیں بیٹا! بس بھائی کی صحت اور زندگی کے لیے بہت دعائیں کرتا۔ پھر

انہوں نے پاس کھڑی رومی کے گرد اپنا بایاں بازو حائل کر کے اسے بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔

”روما! بیٹے! بہن کو تنگ نہیں کرنا اور بھائی کے جلدی اچھا ہو جانے کی دعا کرنا۔

رومی نے سر ہلا دیا اور تب ہی ماما کی انگلی تھا سہ کھڑے ریان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا

اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے میں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لپٹا کر خوب پیار کیا تھا پھر وہ

چلے گئے گھر میں یکدم ہی اداسی اتر آئی تھی۔ ہر چیز اداس اور خاموش لگ رہی تھی ماما اور پاپا

تین ماہ وہاں رہے تھے پہلے پندرہ دن مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے اور پھر آپریشن ہو گیا لیکن

کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ انہیں رکنا پڑا ایسا کافون آتا تھا اور بیا ہمیں بتاتی رہتی

تھیں کہ وہ اب ٹھیک ہے اب بہتر ہو رہا ہے اور ہم بھی کبھی کبھی پاپا سے بات کر لیتے تھے ان

تین ماہ میں میرے اندر ایک خاص طرح کا احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا تھا گویا بھی نہیں لیکن میں سمجھتی تھی کہ رومی کا ہر طرز سے خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ وہ میری بہن ہے اور ماں یہاں نہیں ہیں شاید انہی دنوں میں میرے اندر اس کے لیے مانتا جیسا جذبہ پیدا ہوا تھا میں اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھتی تھی اس کا ہوم ورک مکمل ہے۔ رات کو جیناں نے اسے دودھ کا گلاس دیا ہے یا نہیں، اس کا یونیفارم استری کیا جوتے پالش کیے وغیرہ اور خود رومی تو ہر وقت میرے ارد گرد رہتی تھی حتیٰ کہ میں واش روم جاتی تو وہ بیڈ سے اٹھ کر واش روم کے دروازے پر کھڑی رہتی تھی۔ شاید وہ ماما پاپا کے چلے جانے کے بعد خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی تھی حالانکہ گھر میں ملازم چوکیدار جیناں اور اس کا میاں جو ڈرائیور تھا ایک لڑکا قاسو اور سب سے بڑھ کر بیا تھیں جو ماما پاپا کے جانے کے بعد اپنے پورشن سے ہمارے پورشن میں آگئی تھیں شروع کے چند دن تو میرے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم جیسے ہم گیسٹ روم کہتے تھے سوتی رہی پھر میری اور رومی کی ضد پر وہ ہمارے بیڈ روم میں آگئی تھیں رومی میرے بیڈ پر میرے پاس ہی سو جاتی اور بیا دوسرے بیڈ پر پاس ہی سو جاتی تھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم نے تین ماہ میں بیا کے ساتھ بہت انجوائے کیا تھا پہلی بار ہمیں بیا نے کہانی سنائی تو پھر رومی روز ہی فرمائش کرنے لگی میرے زندگی کے یادگار دنوں میں سے کچھ دن تھے میں اگرچہ آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی لیکن رومی کے ساتھ بیا کے کمرے میں گھس کر اتنے ہی شوق سے شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیاں سنتی تھی جتنے شوق سے رومی سنتی تھی۔

ان دنوں بیا نے ہمیں بہت سی کہانیاں سنائی تھیں۔

نیلے داڑھی والا بوڑھا

پانچٹی والی سرائے

یہ سب ایسی کہانیاں تھیں جو میں نے کہیں نہیں پڑھی تھیں حالانکہ بچپن سے ہی مجھے کہانیاں پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور پاپا اکثر مجھے فیروز سنز سے کہانیوں کی کتابیں لاکر دیتے

تھے میں اخبار جہاں کابچوں کا میگزین بھی لفظ لفظ چاٹ جاتی تھی اپنی ہر برٹھ ڈے پر مپا سے کہانیوں والی کتابوں کی ہی فرمائش کرتی تھی لیکن جو کہانیاں بیا سنایا کرتی تھیں۔ ان میں بڑی دلربائی تھی۔ چارم تھا۔

لال باغ میں گئی تھی

ہائے میرے انگلی، ہائے میرا ہاتھ

بڑھیا جوان ہوئی

ہوئیاں بابا سوئیاں

بڑھیا جوان ہوئی

ہوئی ہوں بابا ہوئی ہوں

جب رومی دن میں ایک ٹانگ پر اچھلتی ہوئی گاتی تو خود بخود میرے لب بھی ہلنے لگتے تھے۔

ان دنوں میں نے نماز باقاعدگی سے پانچوں وقت پڑھنی شروع کر دی تھی میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن اب جب بیا نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا تیں اور ریان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں تو میں سوچتی تھی کہ پپا نے مجھے دعا کرنے کو کہا تھا تو مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں ریان کے لیے کیسے دعا کروں تو مجھے نماز پڑھ کر ریان کے لیے دعا کرنی چاہیے وہ میرا ایک ہی بھائی ہے اور ماما کو بہت پیارا ہے یوں میں نے بیا سے پوچھ پوچھ کر کچھ دن نماز پڑھی اور پھر خود ہی پڑھنے لگی اور یہ عادت اب تک نہیں چھوٹی اب بھی باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ بس میرے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اگر میں نے نماز پڑھنا اور دعا کرنا چھوڑ دیا تو ریان پھر بیمار ہو جائے گا جب میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہوتی تو رومی بھی بیا کا بڑا سا ڈو پٹہ لپیٹے میرے ساتھ کھڑی ہو جاتی میری طرح رکوع اور سجود میں جاتی میری طرح ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی ابھی اسے پوری نماز نہیں آتی تھی لیکن اس نے قاری صاحب سے جو اسے قرآن

پاک پڑھانے آتے تھے کہا کہ وہ اسے جلد از جلد پوری نماز پڑھنا سکھا دیں اور پھر حیرت انگیز طور پر اس نے بڑی جلدی جلدی سب یاد کیا تھا حتیٰ کہ دعائے قنوت بھی یاد کر لی تھی وہ اتنی سی عمر میں وہ کام کرنے کی کوشش کرتی تھی جو میں اس عمر میں کر رہی تھی پھر ایک دن بیا نے بتایا کہ ممایا آرہے ہیں ہم انہیں لینے ایئر پورٹ گئے تھے ریان پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا تھا لیکن پیانے بتایا تھا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کے دل میں جو سوراخ تھا وہ بھر دیا گیا تھا۔

”پیا وہ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔“ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ہاں لیکن اب آہستہ آہستہ اس کی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔“

پیانے مجھے تسلی دی۔ گور ریان کی بیماری دور ہو گئی تھی لیکن شاید کمزوری یا احتیاط کے خیال سے ممانے اسے سکول نہیں بھیجا تھا چونکہ یہ ایک پرائیویٹ سکول تھا اس لیے ممانے نے انتظامیہ سے بات کر لی تھی ریان صرف سسٹر کا امتحان دینے سکول جاتا تھا اس کی فیس جمع ہوتی رہتی تھی اور گھر میں ٹیوٹر اسے پڑھانے کے لیے آنے لگا تھا ممانے بہت کم باہر نکلنے دیتی تھیں وہ ہر وقت جیسے اسے اپنی حفاظت کے حصار میں لیے رکھتی تھی یوں ایک بار پھر ریان ہم سے دور ہو گیا تھا

ریان اور رومی کی پیدائش کے سات سال بعد اب پہلی بار میں نے ممانے کے چہرے پر سکون دیکھا تھا لیکن پھر بھی وہ ریان کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں ہولے ہولے ریان کے رخساروں پر سرنخی آنے لگی تھی اس کا جسم بھی بھرنے لگا تھا اور وہ بے حد خوبصورت ہو گیا تھا اور اکیٹو بھی یوں جب میں میٹرک کا امتحان دے کر رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی اور رومی پانچویں جماعت میں آگئی تھی تو ممانے ایک بار پھر ریان کو سکول میں بھیجنا شروع کر دیا تھا وہ رومی سے ایک سال پیچھے تھا فورتحہ کلاس میں۔ ان دنوں میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ممانے میرے ساتھ روکھا اور اجنبی سا ہے اب ریان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ رومی کی طرف بھی توجہ دینے لگی تھیں انہوں نے رومی کی طرح کبھی کسی معاملے

میں میری رہنمائی نہیں کی اگر بیاناہ ہوتیں تو۔۔۔۔۔ یہ بیا ہی تھیں کہ جب جب مجھے رہنمائی کی ضرورت ہوئی انہوں نے مجھے گائیڈ کیا آٹھ سال ممانے سے کٹ کر رہی تھیں حالانکہ رومی اور ریان کی پیدائش سے پہلے وہ بہت سوشل ہوا کرتی تھیں کلب، پارٹیاں اور جم۔۔۔۔۔ وہ زندگی کو پورا پورا انجوائے کرنے کی قائل تھیں لیکن یہ ریان تھا جس نے ہر اکیٹیو بیٹی سے انہیں دور کر دیا تھا لیکن اب ایک بار پھر وہ اتنی ہی سوشل ہو گئی تھیں وہ باقاعدگی سے جم خانہ جانے لگی تھیں انہوں نے دو تین این جی اوز بھی جوائن کر لی تھیں اپنے طبقے کی خواتین کے ساتھ مل کر انہوں نے اپنے ایریے میں ایک لیڈی کلب کی بھی بنیاد رکھ دی تھی پیا کو ان کی کسی بھی سرگرمی پر کوئی اعتراض نہیں تھا وہ خود بھی بے حد مصروف رہتے تھے میں نے جب کالج میں ایڈمیشن لیا تو ممانے اچانک ایک دن ناشتے کی ٹیبل پر کہا کہ رومی کے لیے الگ روم ہونا چاہیے پیانے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”کیا ضرورت ہے دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں ٹھیک ہیں۔“

”یہ غلط بات ہے فصیح صاحب، آپ نہیں دیکھتے رومی ہر بات میں سوی کی نقل

کرتی ہے۔“

”تو اس میں کیا حرج ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ شخصیت ہے اپنی انفرادیت

ہے۔“

ممانے سے بحث کر رہی تھیں۔ جب میں ناشتہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی مجھے کالج سے دیر ہو رہی تھی آج رومی اور ریان کے سکول میں چھٹی تھی ان کو ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی جبکہ مجھے کالج جانا تھا وہ دونوں ابھی سو رہے تھے میں ممانے کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی لیکن کالج میں بھی میرا ذہن الجھا رہا تھا میں مسلسل رومی کے متعلق سوچتی رہتی تھی وہ تو بہت ڈرپوک ہے رات کو اکیلے کیسے سوئے گی اب بھی اکثر آدھی رات کو اٹھ کر میرے بیڈ پر آ جاتی ہے۔

”سوی مجھے ڈر لگ رہا ہے میں تمہارے پاس آ جاؤں؟“

اس روز میڈم زہیری نے مجھے پہلی بار ڈانٹا تھا پتا نہیں انہوں نے کیا پوچھا تھا

جیسے ان کے طبقے کے دوسرے لوگوں کے بچے رہتے ہیں اور شاید اپنے بیڈ کے ساتھ والا بیڈ روم ریان کے لیے سیٹ کر دیا تھا۔

ریان کے بیڈ روم میں بھی رومی کے بیڈ روم کی طرح ہی ممانے سب سیٹنگ اپنی پسند سے کی تھی جب پہلے روز رومی اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی تھی تو پہلے مجھ سے لپٹ کر یوں روئی تھی۔ جیسے کہیں دور جارہی ہو اور مجھے بھی اس پر ترس آیا اور بہت دیر سے نیند آئی تھی پڑھنے میں بھی دل نہ لگا تھا بار بار یہی خیال آتا رہا کہ اگر رومی رات کو ڈرگنی تو اور پچ نہیں رات کا کون سا پہر تھا شاید دو بجے تھے جب دستک سے میری آنکھ کھل گئی اور ساتھ ہی رومی کی مہین کی آواز آئی۔

”سوی یہ میں ہوں پلیز دروازہ کھولو۔“

اور میں نے تقریباً بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازہ کھولا تھا باہر رومی کھڑی تھی ہولے ہولے کانپتی ہوئی۔۔۔

”سوی مجھے ڈر لگ رہا ہے میں یہاں سو جاؤں تمہارے پاس۔“

اور میں اسے اندر لے آئی تھی اور اس کے بعد بھی اب تک وہ یونہی کرتی ہے اکثر رات کو ماما کے سونے کے بعد میرے کمرے میں آ جاتی ہے حالانکہ اب وہ خود کالج کی طالبہ ہے ابھی اسی سال اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا ہے پھر بھی وہ بالکل بچوں جیسی لگتی ہے مجھے معصوم اور بھولی بھالی سی۔ نو دس سال کی بچی میں بھی اس کی ہر بات ہر چیز کا اس طرح خیال کرتی ہوں جیسے پہلے کرتی تھی کیونکہ ماما کے پاس تو اب بھی وقت نہیں ہوتا اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ مصروف رہتی ہیں پچھلے تین سال سے وہ قومی اسمبلی کی ممبر ہیں ایم این اے بننے کے بعد سے تو ان کی مصروف دگنی ہو گئی ہے اب تو اکثر اسلام آباد چلی جاتی ہیں اور دو دو ہفتے وہ نہیں آتیں اسمبلی کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں یہ اجلاس کیوں ہوتے ہیں؟

ایک بار حسان نے کہا تھا۔ ”یہ اسمبلیاں اور یہ اجلاس کرتے کراتے تو کچھ نہیں ہیں ملک انہیں مسائل سے دوچار ہے جن سے پچاس سال پہلے تھا بلکہ اب تو کرشن اور بھی

لیکن میں تو اپنے ہی دھیان میں تھی گھر آئی تو رومی منہ بسورے میرے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ”سوی! ماما مجھے الگ روم دے رہی ہیں۔“ مجھے دیکھتے ہی وہ بیڈ سے اچھل کر اتر آئی۔

”اچھا ہے اسے اپنی پسند سے ڈیکوریٹ کرنا۔“ میں ہنس دی۔

”نہیں سوی مجھے الگ بیڈ روم نہیں چاہیے۔“ وہ منہ بسورے لگی تھی۔ میں نے اپنے سے پانچ سال چھوٹی بہن کو دیکھا جو اس وقت دس ساڑھے دس سال کی تھی اور میں بھی سولہویں سال میں قدم رکھ چکی تھی لیکن مجھے لگتا تھا جیسے میں اس سے بہت بڑی ہوں اور وہ مضطرب سی لگتی ہے۔

”لیکن رومی ماما چاہتی ہیں اور ہمیں ماما کی بات ماننی چاہیے۔“

”لیکن وہ ریان کیوں ابھی تک ماما کے بیڈ روم میں سوتا ہے؟“

”وہ بیمار ہے نا اس لئے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”لیکن اب کہاں بیمار ہے موٹو، ہٹا کٹا ہے۔“ اب تو اسے غصہ آ رہا تھا ورنہ اسے ریان سے بہت پیار تھا اور وہ اکثر اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ ماما ریان کو ہم سے کھیلنے اور ملنے کیوں نہیں دیتیں ریان ایک بار پھر ہم سے دور ہو گیا تھا کم گو اور خاموش طبع ساریان ہم دونوں کو ہی بہت اچھا لگتا تھا رومی کے رونے دھونے کے باوجود ممانے میرے ساتھ والا گیسٹ روم اس کے لیے سیٹ کر دیا تھا بہت خوبصورت شوخ رنگ کے پردے، نیا کارپٹ ڈائیننگ ٹیبل، کمپیوٹر، ڈھیروں کھلونوں سے سجاوٹ کس۔

رومی نے بیا سے بھی شکوہ کیا تھا تو بیا مسکرا دی تھیں۔

یہ بچوں کے الگ بیڈ روم بھی شیٹس سہیل ہے جانو اور جیا تو ہمیشہ سے ہی شیٹس کا نشہ ہے۔

رومی تو بیا کی بات نہیں سمجھی تھی، لیکن میں سمجھ گئی تھی ماما کی سب فرینڈز کے ہاں بچوں کے الگ بیڈ روم تھے اور شاید ماما بھی چاہتی تھیں کہ ان کے بچے بھی ایسے ہی رہیں

بڑھ گئی ہے۔“

اب یہ اسمبلیاں کچھ کریں یا نہ کریں اجلاس تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ماما کو بھی اس دوران اسلام آباد رہنا پڑتا ہے اور ماما کے اس طرح اسلام آباد جانے کا سب کو ہی فرق پڑتا تھا چاہے پہلے چھ سات بجے تک گھر آجاتے اب لیٹ آتے تھے۔ میں رومی اور بیاتہا کی محسوس کرتے ہیں لیکن سب سے زیادہ فرق ریان کو پڑا ہے وہ ماما کی اس مصروف زندگی کی وجہ سے بہت اکیلا اور تنہا ہو گیا ہے ہم سے تو وہ کبھی بے تکلف نہیں رہا سوائے کلاس کے ایک سال کے لیکن ماما جو ہر وقت اپنے پروں کے نیچے دبائے رکھتی تھیں اب اپنی بے تحاشا مصروفیات اور اسلام آباد جانے کی وجہ سے اس پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتیں نتیجتاً وہ اکیلا ہو گیا ہے بلکہ وہ بہت پہلے ہی اکیلا ہو گیا تھا جب ماما بھی ایم این اے نہیں بنی تھیں تب ہی اس کا شیڈول کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ ماما کے ساتھ باتیں شیئر کرنے کا اسے بہت کم بلکہ وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ ساتویں جماعت سے ہی سکول میں اولیول کرنے والے بچوں کی تیاری شروع ہو جاتی تھی اور ماما چاہتی تھیں کہ وہ اولیول اور اے لیول کر کے باہر پڑھنے کے لیے جائے۔ سکول سے آکر کھانا کھا کر وہ گھنٹہ بھر آرام کرتا تھا پھر اس کا ٹیوٹر آ جاتا تھا جو آرٹس کی تیاری کرواتا وہاں سے تقریباً سات بجے آتا تھا اس وقت ماما گھر پر نہ ہوتیں جم یا کسی این جی او کی میٹنگ میں شرکت کے لیے گئی ہوتی ہوتیں۔ زیادہ تر یہ وقت ان کا جم جانے کا ہوتا تھا اور جب ماما گھر آتیں تو وہ سونے کے لیے جا چکا ہوتا یوں ماما سے کبھی کبھار ہی اس کی تفصیلی ملاقات ہوتی تھی۔ صبح ڈرائیور ہم تینوں کو اکٹھے لے کر جاتا تھا پہلے ان دونوں کا سکول آتا تھا میں بالکل پاپا کی طرح ان کی پیشانی چوم کر خدا حافظ کہتی اور رومی کو ریان کا خیال رکھنے کی تاکید کرتی تھی حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر ڈرائیور مجھے کالج میں ڈراپ کرتا تھا ہاں نہیں کیا بات تھی میں جب سے کالج میں آئی تھی ماما کے رویے کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی یا نہ پلادہ باشعور کہ مجھے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ ماما مجھ سے بالکل بھی محبت نہیں کرتیں ناشتے کی ٹیبل پر، کھانے کی میز پر یا بیڈی لاؤنج میں ان کے

ساتھ بیٹھے ہوئے میں نے بار بار محسوس کیا تھا کہ ماما کی جو نظر رومی اور ریان کی طرف اٹھتی ہے اس میں مامتا اور محبت کے رنگ ہوتے ہیں اور جب وہ میری طرف دیکھتی ہیں تو مجھے لگتا تھا جیسے ان کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو اور نظریں ہر احساس سے خالی بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ان کی نظروں میں بڑی سخت سی سرد مہری محسوس ہوتی تھی پتا نہیں ایسا کیوں تھا اور میں ایسا کیوں سوچتی تھی ایک بار پھر میں بچپن کی طرح سوچنے لگی تھی کہ شاید میں ماما کی سوتیلی بیٹی ہوں۔

تب ایک روز جب میں بیا کے کھننے پر سر رکھے لیٹی تھی اور رومی ماما کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی وہ جاننا نہ چاہتی تھی اور اس نے دو تین بار کہا کہ ماما سوئی کو ساتھ لے چلیں لیکن ماما نے انکار کر دیا تھا۔

”برتھ ڈے تمہاری اور ریان کی ہے سوئی کی نہیں اور تمہارے لیے شاپنگ کرنا ہے۔“

”لیکن ماما ہماری برتھ ڈے پر سوئی کو بھی نیا ڈریس پہننا ہوگا۔“

رومی کبھی کبھی ماما سے بحث کرنے لگتی۔

”تو!“

ماما نے صغیر اچکا کر مجھے دیکھا تھا۔

”مجھے سوئی کا ماپ معلوم ہے اور تم ہر سال بڑھ رہی ہو اور پھر بیا کی طبیعت ٹھیک

نہیں ہے سوئی ان کے پاس رہے گی۔“

اور ماما کے جانے کے بعد میں بیا کے پاس آگئی تھی اور اب بیا کے گھنٹوں پر سر

رکھے پوچھ رہی تھی۔

”بیا کیا آپ کو یقین ہے میں ماما کی سگی بیٹی ہوں؟“

اور بیا نے مجھے بچپن کی طرح یقین دلایا تھا کہ میں ماما کی سگی بیٹی ہوں لیکن پتا نہیں

کیوں میں متذبذب تھی اور کھوج میں تھی ایک روز میں نے ماما کی شادی کی البم پر ان کی

شادی کی تاریخ دیکھی تھی میری پیدائش سے آٹھ برس پہلے کی۔ بیاہج کبھی تھیں کہ ان کی شادی کے آٹھ برس بعد پیدا ہوئی تھی پھر کیا تھا ایسا کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں وہ نہیں جو روی ہے۔ شاید میں اتنی بڑی نہیں ہوئی ہوں کہ رویوں کو صحیح طرح سے Judge کر سکوں شاید ایسا ہی ہوتا کہ کسی بچے سے والدین کو زیادہ لگاؤ نہ ہوتا ہو اس کے علاوہ تو کچھ ایسا نہیں تھا جو ثابت کرتا کہ میں ممپا کی سگی بیٹی نہیں ہوں میں بہترین کالج میں پڑھ رہی تھی مجھے زندگی کی ہر سہولت میسر تھی ایسا نہیں تھا کہ ممپا میرے لیے کسی گھٹیا شاپ سے یا کٹر بوتیک سے شاپنگ کرتی ہوں سب صحیح تھا شاید پھر میں ہی اتنی سمجھدار نہیں تھی شاید میں خواہوں کی دنیا میں رہتی تھی میں نے خود کو سمجھا لیا تھا اور ممپا کے رویے کو محسوس کرتا چھوڑ دیا تھا پھر بھی کبھی کبھی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ میرا دل بچھ جاتا جیسے اندر کی ساری روشنیاں گل ہو گئی ہوں جب روی نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور کالج میں ایڈمیشن لینا تھا تو ممپا نے پوچھا تھا۔

”روی تم کون سے بچیکٹ رکھ رہی ہو؟“

”وہی جو سوی کے ہیں۔“

”وہاٹ!“

ممپا بلند آواز سے بولی تھیں۔

”پاگل ہو گئی ہو تم، یہ مشورہ تمہیں سوی بیوقوف نے دیا ہے۔“

”نومرا! میرا اپنا خیال ہے۔“

”نہیں! تم بائیو، کیمسٹری اور فزکس رکھو تمہیں ڈاکٹر بننا ہے۔“

”لیکن ممپا مجھے ڈاکٹر نہیں بننا، میں وہی بچیکٹ پڑھوں گی جو سوی پڑھ رہی

ہے۔“

ان دنوں میں یونیورسٹی میں سائیکالوجی کے پہلے سال میں تھی۔ ہمارے فائل

ایگزیم ہونے والے تھے روی کا احتجاج جاری رہا لیکن ممپا مان ہی نہیں رہی تھیں۔

”میری خواہش ہے یہ بیا۔“

بیا کے سمجھانے پر کہ وہ ضد چھوڑ دیں انہوں نے کہا تھا بہت پہلے میں نے سوچا تھا میری بیٹی ہوگی تو میں اسے ڈاکٹر بناؤں گی اگر بیٹا ہوا تو وہ انجینئر بنے گا اور میں جو بیا کی وارڈ روپ صاف کر رہی تھی یکدم سن ہو گئی تھی جب میں نے فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تھا تو ممپا نے جب تو ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور نہ ہی میرے بچیکٹ کے سلسلے میں کوئی انٹرسٹ ظاہر کیا تھا ورنہ اگر ممپا مجھ سے کبھی تو میں ضرور پری میڈیکل لے لیتی میں نے تو بس یوں ہی اپنی مرضی سے بچیکٹ سلیکٹ کیے تھے حالانکہ میری لچر نے مجھے کہا تھا کہ میں نے اتنے اچھے نمبر لیے ہیں تو مجھ پر پری میڈیکل میں جانا چاہیے لیکن چونکہ میری فرینڈ نائید نے سائیکالوجی اور انگلش رکھی تھی تو میں نے بھی یہی بچیکٹ رکھ لیے تھے اس روز پھر میرا ذہن بکھرا بکھرا سا رہا تھا اتنے سالوں بعد اب جبکہ میرے اپنے خیال میں میں کافی میچور ہو چکی تھی اور یونیورسٹی میں میرے لچر ز اور ساتھی میری ذہانت اور سمجھ کی بہت تعریف کرتے تھے اور اس روز بہت سالوں بعد میں نے ممپا کے جانے کے بعد بیا سے شکوہ کیا تھا۔

”بیا کیا میں ممپا کی بیٹی نہیں ہوں اور کیا ممپا مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میں ڈاکٹر بنوں۔“ اور بیا کے پاس تو ہر سوال کا جواب موجود ہوتا تھا۔

”جانو جب تم نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا ان دنوں جیپا پریشان بھی بہت رہتی تھی ریان کی وجہ سے۔ گوریان کا کامیاب آپریشن ہو گیا تھا وہ صحت مند بھی ہو رہا تھا پھر بھی اس کا دھیان اس کی طرف لگا رہتا تھا اور میں نے بظاہر بیا کی بات مان لی تھی کہ شاید ایسا ہی ہوگا اور روی سے کہا تھا کہ وہ پری میڈیکل میں جائے لیکن روی نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”مجھے ڈاکٹر بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

ممپا اگرچہ روی سے کافی ناراض ہوئی تھیں لیکن میں نے روی کا ساتھ دیا تھا۔ تم زبردستی کرو گی تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے گی اور اب ماشا اللہ اپنی کلاس میں فرسٹ آتی ہے ممپا انہی دنوں اسلام آباد چلی گئی تھیں ورنہ شاید وہ ضد کرتیں یوں روی بھی میری طرح

سایکالوجی اور فلاسفی وغیرہ پڑھنے لگی تھی اس کے بعد پھر شاید ممانے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی دراصل ان کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا تھا اسلام آباد سے گھر آتے تو یہاں بھی پارٹیاں، ڈنر، لُنج، فلاں این جی او، فلاں کلب۔ گھر میں تو کم ہی نظر آتی تھیں لیکن جب سے رومی کالج جانے لگی تھی اکثر گھر میں بھی کوئی ڈنر پارٹی اریج کر لیتی تھیں اور گھر میں ہونے والے فنکشنز میں ہم بھی شریک ہوتے تھے کئی بار میرا جی چاہتا تھا میں ان فضول پارٹیوں میں نہ جاؤں لیکن محض رومی کی وجہ سے شامل ہو جاتی رومی بہت پر جوش ہوتی تھی۔

”چلو تا سوی، ممانے کہا ہے۔“ اور وہاں کئی ستائش بھری نظریں ہماری طرف اٹھتیں مجھے رومی کے ساتھ الگ تھلک بیٹھے ہوئے بھی محسوس ہوتا رہتا کہ ہم بہت ساری نظروں کے حصار میں ہیں۔

”سچ مسز فصیح احمد آپ بہت لگی ہیں اتنی پیاری بیٹیاں اور بیٹا نہ صرف پیارے بلکہ ذہین۔“ کوئی کہتا اور پھر کسی کی آواز کانوں میں پڑتی۔

”میں تو کہتی ہوں بیٹا خواہ کیسا بھی ہو چل جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ بیٹی دے تو خوبصورت ہو اور تم اس معاملے میں بھی خوش نصیب ہو دو دنوں بیٹیاں اتنی خوبصورت ہیں کہ بندہ ایک بار مہبوت ہو جاتا ہے۔“ اور یہ سچ بھی تھا رومی اور میں ہم دونوں ہی خوبصورت کہلائے جاسکتے تھے رومی کا رنگ مجھ سے تھوڑا فیر تھا لیکن میرا کمپلیکشن بھی بہت اچھا تھا۔ تاہم تو کہتی تھی یا اگر تم کسی کی طرف نظر بھر کے دیکھ لو وہ ہیں پٹ سے گر جائے۔

اور کئی بار میں نے آپہٹے میں خود کو دیکھا تھا اور سوچا تھا میں خوبصورت تو نہیں ہوں پھر ماما۔۔۔۔۔؟ خواتین کی تعریف پر ماما ایک تغیر بھری نظر رومی اور مجھ پر ڈالتی تھیں اور وہ نظر مجھے جیسے مہنوں خوش رکھتی تھی۔ لیکن آج۔۔۔ آج ممانے یہ کیا کہا تھا اور کیا ہوا تھا میں نے یاد کرنے کی کوشش کی ماما کو گئے کتنی دیر ہو گئی تھی لیکن میں ابھی تک اسی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ میرا ذہن بالکل خالی خالی تھا ہاں آج صبح یونیورسٹی میں جب میں لائبریری کی طرف ایک خاص کتاب کی تلاش میں جا رہی تھی کہ بالکل اچانک حسان نے مجھے پیچھے سے

آواز دی۔

”سمعیہ۔۔۔ سمیعہ احمد!“

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ یہ حسان تھا میرے ہی ڈیپارٹمنٹ کا، بائے نیچر وہ دوسرے لڑکوں سے خاصا مختلف تھا پورے ڈیپارٹمنٹ میں اس کا کوئی گہرا دوست نہ تھا لیکن وہ سب کا دوست تھا نامہ علی کے والد کو کینسر ہوا تو اس نے دن رات شوکت خانم ہسپتال کے چکر لگائے۔ مراد چوہدری بیمار پڑا تو بھی۔ اس نے کبھی اپنے کاموں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا لیکن کبھی کوئی کسی مشکل میں گرفتار ہوتا تو وہ بڑی خاموشی سے کسی کو کوئی احساس دلانے بغیر اس کی مدد کو موجود ہوتا وہ ڈیپارٹمنٹ کا سب ڈین لڑکا تھا لیکن اسے شاید اس کا احساس نہ تھا نہ غرور نہ فخر وہ بے حد عام انداز اپنائے رکھتا تھا۔ سانولا سا، خوبصورت آنکھوں والا، پانچ فٹ گیارہ انچ قد کا سمارٹ سا حسان اپنی نیچر کی وجہ سے مجھے پسند تھا ان دو سالوں میں چند ہی بار میری اس سے بات ہوئی تھی اور میں اس کی گفتگو سے ہمیشہ کسی نہ کسی انداز میں متاثر ہوئی تھی وہ مشہور سرجن محسن رضا کا بیٹا تھا وہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ کارڈیالوجی میں ان کا ایک نام تھا اس کے تین بڑے بھائی اور ایک بہن بھی ڈاکٹر تھی لیکن وہ سب سے چھوٹا تھا اس نے میڈیکل لائن اختیار کرنے کے بجائے سایکالوجی پسند کی تھی۔

”دراصل آج کا انسان جسمانی سے زیادہ روحانی بیماروں میں مبتلا ہے اس کی روح بیمار ہے۔“

ایک بار وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

”جسمانی بیماری کے علاج کے لیے بہت سے قصائی موجود ہیں اپنے فن میں ماہر ہیں۔ تم اپنے بھائیوں اور ڈیڑھ کو بھی قصائی کہہ رہے ہو۔“ مخاطب شاید افضل منہاس تھا۔

”ہاں اس میں کیا حرج ہے اگر وہ قصائیوں والا کام کر رہے ہیں تو قصائی کبھی اس بات پر شرمندہ نہیں ہوتا اگر اسے قصائی کہا جائے۔“

وہ یوں تو بہت کم گو تھا لیکن جب بولتا تو مخاطب کو لا جواب کر دیتا۔

”ناظمہ شیرازی“

اس نے جیسے زیر لب کہا۔

”خبروں میں خاصی ان رہتی ہے تمہیں یاد نہیں آ رہا بھی پچھلے دنوں اس کے متعلق اخباروں میں آیا تھا کہ عرب امارات اور کئی دوسرے ممالک میں جوڑکیاں اغواء کر کے بھیجی جاتی ہیں اور جو لوگ اس گھناؤنے کاروبار میں شامل ہیں ان میں ایک ناظمہ شیرازی بھی ہیں۔“

”اور مجھے ایک دم یاد آیا تھا۔ ہاں اس سلسلے میں ان کے پارلر کا نام بھی آیا تھا بڑا مشہور بیوٹی پارلر ہے اس کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ وہاں کمروں میں خفیہ کمرے لگے ہوئے ہیں جب لڑکیاں۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں وہی پھر لڑکیوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے اور۔۔۔۔۔“

حسان نے سیری بات کاٹ دی تھی۔

”پھر کیا ہوا اس کا، ناظمہ شیرازی کا؟“

میں نے حسان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیا ہونا تھا اس کا بیوٹی پارلر آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں

اس کے، بہت اوپر تک رسائی ہے دو چار اخباروں میں چھپتا رہا پھر خود ہی معاملہ ختم ہو گیا یہ

ہی نہیں بلکہ وہ جو بنگلہ دیشی لڑکیوں کی خرید و فروخت کا اسکیئنڈل مشہور ہوا تھا اس میں بھی یہ

ناظمہ شیرازی ملوث تھیں شروع شروع میں اخباروں میں اس کا نام آیا پھر غائب ہو گیا۔“

اس سے میں نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

یہ حسان آخر مجھے ناظمہ شیرازی کے متعلق کیوں بتا رہا ہے اور مجھے بھلا اس ناظمہ

شیرازی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

”یہ جو ناظمہ شیرازی ہے نا“ اس کا تعلق راولپنڈی کے قریب ایک چھوٹے سے

گاؤں سے ہے اس کا باپ ایک غریب مزدور ہے اور وہ شاید آج بھی وہاں اسی گاؤں

”تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ جتنے بھی ڈاکٹر ہیں قصائیوں والا کام کرتے ہیں بچارے مریض کو چیر پھاڑ کر پھر اس چیر پھاڑ کی قیمت وصول کرتے ہیں اور اس سے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔“

اور افضل منہاس شاید یہ پوچھ کر کہ وہ اپنے بہن بھائیوں کی طرح ڈاکٹر کیوں نہیں بنا، پچھتا رہا تھا لیکن میں ان کے پیچھے بیٹھی اس کی گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھی۔

”روح کو دیمک چاٹ رہی تھی ہزاروں بیماریاں لگی ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے نفسیات پڑھنا چاہیے۔“

”لیکن سائیکاٹرسٹ بننے کے لیے تو ایم بی بی ایس کی ڈگری چاہیے۔“

”ہاں، میں سائیکا لو جسٹ بننا چاہتا ہوں۔“

”تمہارے ڈیڈ نے اجازت دے دی؟“

”ڈیڈ۔۔۔ وہ ہولے سے ہنسا۔

”وہ تو ابھی تک ناراض ہیں اور میں ان سے کہتا ہوں ان کی روح بھی بیمار ہے ساری اولاد کو ڈاکٹر بنانے کا کریم بیماری ہی تو ہے ناں، باہمی بچاری کو ڈاکٹر بنانے کے لیے انہیں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ پڑیکلیکلو کے نمبر لگوائے جارہے ہیں سپروں کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

حسان نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ لاہور میری جاری ہوں۔

”چلو مجھے بھی ایک کتاب لینی ہے۔“ حسان ایسا لڑکا نہیں تھا جو لڑکیوں سے

لفٹ لینے کے لیے بہانے بناتے ہوں۔ سو میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

”تم نازمہ شیرازی کو جانتی ہو سمیٹھ؟“

”نازمہ شیرازی!“ میں نے چلتے چلتے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا نام کچھ سنا

ہوا سا لگتا ہے۔

میں مزدوری کرتا ہے کیونکہ جب ناظمہ شیرازی نے شہر میں اپنی پسند سے شادی کر لی تو اس نے اپنی بیٹی سے قطع تعلق کر لیا تھا سنا ہے ناظمہ پنڈی کے کسی کالج میں پڑھتی تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی اور اپنی کسی سہیلی کے بھائی سے اس نے شادی کر لی تھی یہ شادی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس شادی سے ناظمہ کو یہ فائدہ ہوا تھا کہ تعلقات بڑے لوگوں، افسروں سے ہو گئے تھے کیونکہ اس کا خاوند کسی گورنمنٹ کے ادارے میں افسر تھا۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”طلاق کے بعد وہاں ہی اس نے ایک ایرانی لڑکے شیرازی سے شادی کر لی جو ایرانی سفارت خانے میں ملازم تھا لیکن دو سال بعد اس سے ہی طلاق لے لی یا اس نے طلاق دے دی لیکن وہ اب بھی خود کو ناظمہ شیرازی ہی کہلاتی ہے۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔

”وہ ناظمہ شیرازی جس کے پاس کبھی ہوسٹل میں ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہوتے تھے جو کبھی کبھی گاؤں آنے کے کرائے کے پیسے اپنی روم میٹ سے ادھار لیتی تھی اور جس کا مزدور باپ نہ جانے کیسے محنت کر کر کے یہ قرض اتارتا تھا اور اس کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ شیرازی سے طلاق لینے کے بعد وہ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر اپنے گاؤں گئی تھی لیکن اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا انہی دنوں اس نے ایک این جی او جانن کر لی جسے یہودیوں کی طرف سے ایڈملٹی ہے آج بھی وہ اس این جی او کی کرتا دھرتا ہے غریب ہونا کوئی جرم نہیں ہے لیکن وہ غریب لڑکی آج ڈیفنس میں رہتی ہے اس کے پاس ایک لینڈ کروزر نہیں کئی گاڑیاں ہیں اس کے پورچ میں بیک وقت تین تین گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔“

”تو!“

میں نے اسے ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”تو سوچنے کی بات یہ ہے سمعیہ احمد کہ یہ اچانک اتنی دولت اس کے پاس کیسے

آئی۔“

”ظاہر ہے کسی غلط ذریعے سے ہی آئی ہوگی لیکن ہمیں اس سے کیا؟“

”ہاں ہمیں کیا لیکن۔۔۔۔۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر کھوجتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔

”یہ آج کل تم اکیلی کیوں آتی ہو پہلے تو تمہاری بہن بھی تمہارے ساتھ ہوتی

تھی؟“ اس نے ایک دم ہی موضوع بدل لیا تھا۔

روی اور میں اکٹھے ہی گھر سے نکلتے تھے اور ڈرائیور مجھے ڈراپ کر کے روی کو اس

کے کالج چھوڑنے چلا جاتا ہے ایک دو بار روی سیرے ساتھ اندر یونیورسٹی میں بھی آئی تھی

اور میں نے اس کا تعارف اپنے ڈیپارٹمنٹ کے طلباء سے کروایا تھا۔

”دراصل روی کے پیچہ ز ہونے والے ہیں فرسٹ ایر کے اور انہیں ایک طرح

سے فری کر دیا گیا ہے وہ صرف ایک دو پیریڈ کے لیے جاتی ہے کسی ٹیچر نے انہیں کہا ہوا ہے

شاید کچھ لیسن رہ گئے ہیں اس لیے وہ دس گیارہ بجے جاتی ہے ڈرائیور چھوڑنے اور لینے جاتا

ہے۔“

میں اب اندر ہی اندر الجھنے لگی تھی مجھے کتاب ایٹو کروانی تھی اور وہ بڑے مزے

سے لائبریری کی دیوار سے ٹیک لگائے یوں کھڑا تھا جیسے اگلے چند گھنٹے تک اس کا وہاں سے

ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

”میرے بڑے بھائی کا ڈرائیور چھٹی پر ہے اور دو دن سے میں اپنی بھتیجی کو کالج

سے پک کرنے جا رہا ہوں وہ وہاں اسی کالج میں پڑھتی ہے جہاں روی۔“

وہ بے حد سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا اب کے میں چونکی تھی آخر وہ کیا کہنا چاہتا

ہے اور اتنی دیر سے کہہ کیوں نہیں پاتا۔

”فارگا ڈسک حسان تمہیں جو کہتا ہے کہہ ڈالو۔“

”سمیعہ میں نے روی کو دیکھا تھا وہ کالج سے نکل کر ناظمہ شیرازی کی گاڑی میں

بیٹھ رہی تھی میں نے سمجھا تھا شاید تم ہوگی لیکن جب ناظمہ شیرازی نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں نے خود کو یقین دلایا کہ شاید یہ لڑکی رومی نہیں کوئی اور ہو، لیکن کل مجھے یقین آ گیا کہ وہ رومی ہی تھی میں نے اپنی جھنجھی سے پوچھا تھا کہ یہ لڑکی، کیا نام ہے اس کا۔ میری کلاس فیلو کی بہن ہے نام یاؤنٹس آ رہا تو اس نے بتایا تھا اس کا نام رومی ہے۔“

میں نے حسان کی بات پورے دھیان سے سنی تھی میں ان دنوں اپنی پڑھائی میں بڑی تھی فائنل ایگزام سر پر تھا اور شاید میں رومی کی طرف سے غافل ہو گئی تھی آخر میرے اور رومی کے درمیان اتنی دوری کب آئی تھی کہ رومی نے مجھے ناظمہ شیرازی کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

”یہ ناظمہ شیرازی اچھی عورت نہیں ہے سمیعہ تم جانتی ہو نا اور تمہاری بہن بہت انوسینٹ ہے۔“

میں نے حسان کے غلوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”کس بات کا شکریہ، احمق لڑکی تمہاری بہن کیا میری بہن نہیں ہے یقین کرو میں کل سے بے کل اور بے چین تھا۔“

اور پھر میں وہاں رکی نہیں تھی اور گھر آتے ہی میں نے رومی سے پوچھا تھا۔

”یہ ناظمہ شیرازی کون ہے اور تمہاری اس سے دوستی کب ہوئی، کیسے جانتی ہو تم اسے؟“

وہ اس وقت میرے ہی کمرے میں میرے ہی بیڈ پر کتا میں پھیلائے بیٹھی تھی۔

”کون ناظمہ شیرازی؟“

وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی شاید پہلی بار میں اس سے اس طرح اونچی آواز میں بات کر رہی تھی۔

”وہ ہی جس کی گاڑی میں تم بیٹھ کر گھر آئی ہو۔“

”وہ تو کرن کی کزن ہیں۔ کرن میری کلاس فیلو ہے نا، پرسوں میں ڈرائیور کا

انتظار کر رہی تھی پھر کرن نے مجھے زبردستی بٹھالیا اور وہ ناز و آہی تو بہت اچھی ہیں بہت کیوت سی اور انہوں نے مجھے کہا تھا کل میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی ڈرائیور کو منع کر دیتا۔“

”اور تم نے منع کر دیا کیوں؟ اور تم کتنا جانتی ہو اس عورت کو، کہ اعتبار کر کے اس کی گاڑی میں بیٹھ گئیں وہ تمہیں اغوا کر لیتی، لے جاتی کہیں تو جانتی ہو وہ کون ہے؟ اور میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی۔“

”مگر سوسی۔۔۔۔“

رومی کی آنکھیں یکدم آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں تھی میں نے بھلا کب اس سے اس طرح بات کی تھی اس لیے میں۔

”چپ کرو یہ وقوف لڑکی!“

میں نے اسے ڈپٹا تھا یونیورسٹی سے گھر آنے تک میں جس قدر خوف اور دہشت میں مبتلا رہی تھی یہ بلند آواز اور ڈانٹ ڈپٹ اسی دہشت کا نتیجہ تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جب ماما کمرے میں داخل ہوئیں تھیں وہ غالباً رات کو ہی کسی وقت اسلام آباد سے لوٹی تھیں بیانے مجھے بتایا تو تھا کہ ڈرائیور کو ایئر پورٹ بھیجا ہے مہارات نوبے کی فلائٹ سے آرہی ہیں میں نے مڑ کر ماما کی طرف دیکھا تھا میں ماما کو بتانا چاہتی تھی رومی کی بیوقوفی، لیکن ماما کی آنکھیں تو غصے سے سرخ ہو رہی تھی اور وہ ایک دم چپچی تھیں۔

”تم۔۔۔ تم رومی کو ڈانٹ رہی تھی تمہیں جرات کیسے ہوئی اسے کچھ کہنے کی۔۔۔“

اور ماما رومی کو لے کر چلی گئیں اور میں ان کے جانے کے کتنی دیر بعد سوچ رہی تھی ماما نے اس طرح کیوں کہا میں نے ماما کے الفاظ کو کتنے ہی معنی پہنائے اور پھر خود ہی رد کر دیے اور بے بسی سے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”بیا ضرور جھوٹ بولتی ہیں میں ماما کی بیٹی ہرگز نہیں ہوں، ضرور ماما نے مجھے کسی سے لیا ہے شاید میں بیا کی بیٹی ہوں اور بیانے مجھے بہن کی گود میں ڈال دیا ہو۔“

”لیکن مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں برگر کھا لیا تھا۔“

میں نے اسے بہلا کر واپس بھیج دیا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے چننا۔“ بیا کھانے کے بعد میرے کمرے میں آئی

تھیں۔

”جی!“

میں نے کبل سے منہ باہر نہیں نکالا تھا لیکن انہوں نے کبل ہٹا کر میری پیشانی پر

ہاتھ رکھا کہیں نمبر پچر تو نہیں ہو گیا اور پھر میری بھیگی ہلکی اور گیلے رخسار دیکھ کر وہ چونکیں۔

”سو می کیا ہوا بیٹا جیانیے کچھ کہا؟“

میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”بیا۔۔۔ بیا آپ مجھے جج کیوں نہیں بتا

دیتیں میں کون ہوں اگر ممی کی بیٹی ہوں تو ممانے یہ کیوں کہا؟“

”جیانیے اس طرح کہا۔ پاگل ہے وہ۔“

لحہ بھر کے توقف کے بعد بیا نے کہا تھا آج پہلی بار بیا نے مجھ سے لگا ہیں چرائی

تھیں۔

”وہ بچپن سے ایسی ہی ہے غصے میں بلا سوچے سمجھے بولتی چلی جاتی ہے بغیر مفہوم و

معانی پر غور کیے اور جب سے ایم این اے منتخب ہوئی اس کا دماغ اور خراب ہو گیا ہے اور تم

پریشان نہ ہو تم بڑی ہونا تو شاید تم سے زیادہ توقع رکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ وہ گھر پر نہیں سو تم

روی اور ریان کا محبت سے خیال رکھا کرو شاید اس لیے۔“

بیا نے خود کو سنبھال لیا تھا اور پہلے کی طرح مجھے سمجھا رہی تھیں لیکن آج بیا کی باتیں

مجھے مطمئن نہیں کر رہی تھیں کچھ تھا جو بے چین کر رہا تھا بیا مجھے سمجھا بجا کر چلی گئی عصر کی اذان

ہو رہی تھی لنگ عموماً ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا پاپا اور ممی تو لنگ پر ہوتے نہیں تھے اور بیا ہمارے

کالج، یونیورسٹی سے آ جانے کا انتظار کرتی تھیں آج کل دن چھوٹے تھے کھانا کھاتے عصر

ہو جاتی تھی بیا کے جانے کے بعد بھی میں یوں ہی کبل اوڑھے سوئی رہی اور روی مجھے سویا

ایک لمحہ کو خیال آیا تھا لیکن نہیں ممانے کہا تھا میں روی کی نوکر، ملازم

ہوں تو کیا میں کسی ملازم کی بیٹی ہوں اور اس نے اپنی وفا نبھانے کے لیے مجھے ماما کو دے دیا

تھا میں نے گھر میں موجود سب ملازموں کا دل ہی دل میں جائزہ لیا لیکن کوئی ایسا نہیں تھا کہ

جو اس تجزیے پر پورا اترتا ہو جیناں مجھ سے آٹھ سال ہی بڑی ہوگی چوکیدار اور مالی۔۔۔

اول ہوں، کوئی بھی نہیں۔۔۔ میں الجھتی رہی روتی رہی پتہ نہیں کتنی ہی دیر گزر گئی تھی جب

روی نے ڈرتے ڈرتے میرے کمرے کا دروازہ کھولا لیکن یہ محسوس کر لینے کے باوجود کہ وہ

روی ہوگی میں نے گھٹنوں سے سر نہیں اٹھایا۔

”سو می!“

روی نے آہستہ سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

”تم رو رہی ہو Sorry میں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔“ میں نے سر اٹھا

کر اسے دیکھا۔

”روی کیا تم میری بہن نہیں ہو کیا میں تمہاری اپنی نہیں ہوں کیا میں تمہیں سمجھا

نہیں سکتی ڈانٹ نہیں سکتی؟“

”تم میری بہن ہو، ماما سے زیادہ میری اپنی ہو اور تم مجھے ڈانٹ ہی نہیں مار بھی

سکتی ہو۔“

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اسے لپٹا لیا اس کا بھلا کیا قصور اس نے تو کچھ

بھی نہیں کہا تھا وہ تو خود میرے ڈانٹنے پر سہم گئی تھی۔

”Sorry روی میں بہت پریشان ہو گئی تھی جب مجھے پتا چلا تھا مجھے بہت ڈر لگا

تھا اس لیے بس۔۔۔۔“

میں نے اسے ساری بات سمجھا دی تھی۔

روی نے بتایا تھا ماما پارلر گئی ہیں اور وہ مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی بیا

بلارہی ہیں۔

”خدا اس ”شہر محبت“ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔“

انہیں بھی شاید وہ کہانی یاد آگئی تھی جو انہوں نے ہمیں بچپن میں سنائی تھی وہ شہر جس کا راجہ بہت نیک اور اچھا تھا اور جس نے اپنے ملک کو پھولوں اور عمارتوں سے سجانے کے بجائے اپنی رعایا کو خوشیوں سے مالا مال کر دیا تھا جو لوگوں سے محبت کرتا تھا اور حجر نے کہا تھا کہ اس کا ملک سب سے خوبصورت ہے کہ وہاں نفرت نہیں محبت ہے وہاں بھوک نہیں غربت نہیں غم نہیں دکھ نہیں جبکہ خوبصورت عمارتوں اور خوبصورت باغات والے ممالک میں نفرت ہے بھوک بیماری ہے غم ہیں دکھ ہے اور حجر نے اس کے ملک کو ”شہر محبت“ کا نام دیا تھا اور اس کے محل کے اندر ایک بنجرے میں بند مینا سا رادن گاتی تھی۔

”یہ شہر محبت ہے“

اس شہر کے لوگوں میں

نفرت نہیں پلتی ہے

اس شہر کے باسی سب

ایک پھول کی پتیاں ہیں

اک ہار کی لڑیاں ہیں

یہ شہر محبت ہے“

رومی بھی مسکرا دی تھی۔

”ہاں بیابا یہ ”شہر محبت“ ہے۔“

اور اسے تو عادت تھی میری ہر بات دہرانے کی۔ پیا اور ریان سوالیہ نظروں سے

سب کو دیکھ رہے تھے۔ تب بیابا نے بتایا تھا اس کہانی کے متعلق اور پیا نے ایک مشکری نظر پیا پر ڈالی تھی۔

”میرے بچوں خصوصاً رومی اور سومی نے ماما کا اصل ذائقہ آپ کی گود میں چکھا

ہے اگر آپ نہ ہوتیں تو یہ ماما کے کئی رنگوں اور ذائقوں سے محروم رہ جاتیں۔“ تب اس روز

کبھ کر بیا کی طرف چلی گئی تھی شاید۔۔۔ ایسا کم کم ہوتا تھا کہ ہم سب افراد کھانے پر اکٹھے ہوتے اور جس روز ایسا ہوتا تو میں اور رومی بہت خوش ہوتے تھے نیبل پر پیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور پھر کھانے کے بعد کچھ دیر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے حالات حاضرہ پر ڈسکس کرتا یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا اس وقت ہم ایک مکمل پرسکون اور خوشحال گھرانے کا تاثر دے رہے ہوتے تھے جس کا ہر فرد ایک دوسرے کا دوست ہو اور ہر فرد ایک دوسرے سے محبت کرتا ہو اور یہ غلط نہیں تھا ماما کی سردمہری اور ریان کی کم گوئی کے ہوتے ہوئے بھی ہم ایک محبت کی زنجیر میں بندے ہوئے تھے اور ایسی ہی ایک رات میں میں نے اس گھر اور ماحول کو ”شہر محبت“ کا نام دیا تھا میں اس وقت پیا کے بالکل پاس صوفے پر بیٹھی ہوئی انہیں چلغوزے چھیل کر دے رہی تھی اور رومی بالکل میرے ہی انداز میں چلغوزے چھیل کر ماما کو کبھی پیا کو کبھی ریان کو دے رہی تھی۔

”ارے تم دونوں خود بھی تو کھاؤ نا۔“

پیا کا سارا دھیان ٹاک شو کی طرف تھا لیکن پھر اچانک ہی انہوں نے میری طرف دیکھا تھا ان دنوں میں کالج میں فور تھ ایر میں تھی اور رومی ناکھٹھ میں اور ریان سینوٹھ میں اور لمبا ہو رہا تھا۔

”پیا دیکھیں تار ریان کتنا لمبا سا ہو گیا ہے۔“ رومی نے پیا کی طرف دیکھا اور ریان جھینپ سا گیا تھا۔

”ماشاء اللہ“

ماما کے لیوں سے بے ساختہ نکلا۔

”میرا ریان اپنے پیا کی طرح اونچا لمبا ہو گا۔“

”بیابا یہ میرا ”شہر محبت“ ہے آج سے ہم اپنے گھر کا نام ”شہر محبت“ رکھ دیتے ہیں۔“ میں نے بیا کے کان میں سرگوشی کی تھی جو میرے بائیں طرف بیٹھی تھیں اور وہ مسکرا دی تھیں۔

کم گوریان نے گلہ کیا تھا۔

”مما آپ نے تو مجھے کوئی کہانی نہیں سنائی۔“

”چند مجھے تو کوئی کہانی آتی ہی نہیں تمہی سے سن لیا کرو۔“

اس روز جیسے بنا کہ یہ اظہار ہو گیا تھا کہ ہم اپنے گھر کا نام ”شہر محبت“ رکھیں گے بہت سارے گھروں کے باہر نام لکھے ہوتے ہیں اور بہت سارے گھر ایسے ہوتے ہیں جن پر کوئی نام نہیں ہوتا اور میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ کسی گھر کی پیشانی پر نام کیوں لکھا ہوتا ہے شاید ایسا ہی کوئی لمحہ ہوتا ہے جب خود بخود کوئی نام تجویز پا جاتا اور پانے بھی گھر کے دروازے پر چند روز بعد ”شہر محبت“ کی نیم پلیٹ لگوادی تھی اس نام نے اتنا فسی نیٹ کیا تھا بپا کو۔

اور اس روز اپنے روزمر کی طرف جاتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میں اور روی بلند آواز میں گاری تھی۔

یہ شہر محبت ہے

اس شہر کے باسی سب

اک پھول کی پتیاں ہیں

اک ہار کی لڑیاں ہیں

میں بی اے فاسل کی طالبہ تھی اور چند دنوں کے بعد میرے ایگزام ہونے والے تھے اور اس کے چند دنوں بعد میں نے یونیورسٹی چلا جانا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے اونچا اونچا گاتے ہوئے میں نے اپنے پیچھے پاپا کی آواز سنی تھی وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے ماما سے کہہ رہے تھے۔

”ہالکس بچیاں ہیں دونوں، ان دونوں کے دم سے کتنی روتی ہے ہمارے شہر محبت میں۔۔۔“ پاپا کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی اور میری آواز غیر ارادی طور پر بلند ہوئی تھی۔

”یہ شہر محبت ہے۔“

لیکن اب میں کبل میں منہ دیے سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی یہ میرا شہر محبت ہے کیا اس پر میرا کوئی حق ہے یا مجھے کہیں اور سے لاکر اس شہر میں رکھا گیا ہے اس روز میں نے نہ عصر کی نماز پڑھی نہ مغرب کی۔ مغرب کے بعد مجھے روی نے اٹھایا تھا۔

”سوی اٹھو نا!“

میں خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم نے کھانا بھی نہیں کھایا جیناں سے کہوں کہ تمہیں چائے بنا دے؟“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا کیونکہ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا منہ ہاتھ دھو کر چائے پی کر میں کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی لیکن کیا میں واقعی پڑھ رہی تھی لفظ جیسے کتابوں کے صفحوں پر ساکت ہو گئے تھے اور ساعتیں وہی الفاظ دہرا رہی تھی زہر میں بجھے الفاظ۔ روی مجھے پڑھتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کیونکہ ماما گھر پر تھیں اور وہ روی کا ہر وقت میرے پاس گھسے رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

میں رات بھی کھانے کے لیے نہیں گئی تھی۔ جیناں بلانے کے لیے آئی تو میں نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر دیا تھا کیا واقعی مجھے بھوک نہیں تھی یا میں ماما پر اپنی ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔ کیا میں چاہتی تھی کہ ماما اپنے لفظوں کی سنگین پر غور کریں اور مجھے منالیں مجھے گلے سے لگالیں اور کہیں۔۔۔ کیا کہیں۔۔۔ کچھ ایسا جو اندر کی ساری نفسی کو چوس لے روح تک میرا بکروے۔

روی نے اندر جھانکا تھا۔

”سوی تم نے صبح بھی کھانا نہیں کھایا تھا پلیرز آ جاؤ نا۔“ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی اور میں نے یا بیبا نے کبھی اسے آپنی یا با جی کہنے کو کہا بھی نہیں تھا مجھے ایسے ہی اچھا لگتا تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے ابھی چائے پی ہے نا، دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی۔

”تھوڑا سا۔“

سوچا میری اب تک کی زندگی میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس سے میں سمجھتی کہ بیا کی محبت نے مجھے بگاڑ دیا ہے بیا کی محبت نے تو ہمیں سنوارا اور بنایا ہی تھا۔ بیا کو شاید ممانے یا بیا نے یا رومی نے کچھ کہا تھا کہ وہ کھانے کے بعد میرے کمرے میں چلے آئے تھے ایسا تو بہت کم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے کمرے میں آتے پتا نہیں اب بیا یا رومی نے یا ممانے کیا کہا تھا بیا سے، میں نہیں جانتی۔

”بیا آپ!“

میں یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر میں نے انہیں بوکھلا کر سلام کیا تھا۔

”علیکم اسلام! آج ہماری بیٹی کی طبیعت کچھ خراب ہے؟“

”نہیں بیا، بس یوں ہی۔“ میں نے نظریں جھکا لیں تھیں آنکھیں ایک دم جلنے لگی تھیں اور آنسو بابرنگنے کو بے تاب تھے۔

”ماں باپ تو بچوں کو ڈانٹتے ہی رہتے ہیں تو کیا بچے ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔“ بیا محبت سے مجھے تکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے میں ابھی تک کھڑی تھی۔ نظریں جھکائے۔

”چلو میں تمہاری ماما کی طرف سے Sorry کرتا ہوں۔“

”نہیں بیا نہیں۔“ میرے ہونٹ کپکپائے تھے۔

میرے بچا دنیا کے سب باپوں سے زیادہ شفیق اور محبت کرنوالے تھے شاید انجانے میں میں نے ان کے دل کو تکلیف دی تھی میں کیسے ان سے Sorry کروں میرے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں آنسو برسانے کو بیتاب۔

”ہاں بیٹا آج بہن کو کیوں ڈانٹا تھا تم نے یقیناً اس نے کچھ بہت غلط کیا تھا؟“

گو یا ممانے بیا کو سب کچھ بتا دیا تھا میں نے یکدم سر اٹھا کر ہاتھوں کی پشت سے

آنسو پونچھنے اور سب کچھ بیا کو بتا دیا۔

”آپ بتائیں ماما! کیا مجھے رومی کو منع نہیں کرنا چاہیے تھا کہ وہ ناظمہ شیرازی

”نہیں میری جان، ضد مت کرو۔“

اور اس میں ضد کرنے یا بحث کرنے کی عادت تو تھی ہی نہیں وہ سر جھکائے چلی گئی لیکن وہ اداس تھی وہ سمجھ رہی تھی کہ ماما کی ڈانٹ سے میں ابھی تک آزرده ہوں۔

اور اس کے بعد بیا چہرے پر تشویش لیے آئیں۔ میں نے پتا نہیں ان کے کندھوں پر پیچھے کیا جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ کیا میں چاہتی تھی کہ ماما مجھے منانے آئیں۔

”تمہارے لیے دودھ اور سلاکس بھجوا دوں؟“

”نہیں بیا کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔“ میں نے کتاب سے نظریں نہیں اٹھائیں

تھیں۔

”اچھا میں جیریاں کو کہتی ہوں کہ دودھ میں اوٹین ڈال کر دے جائے گی۔“

”بیا کو آپ کو پتا ہے مجھے دودھ اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن ایسے خالی پیٹ سو جاؤ گی دن کو بھی کچھ نہیں کھایا۔“

”بیا وہ میں نے بتایا تھا نا یونیورسٹی میں برگر کھالیا تھا۔“ لیکن وہ بیا تھیں

انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا، رتی بھر بھی نہیں۔ وہ جانتی تھیں مجھے اور رومی کو کینٹین سے الابلکھانے کی عادت نہیں ہے۔

”کھانے سے نہیں روٹتے میری جان اور جیا کو میں سمجھاؤں گی۔“ میں خاموش

ہی رہی تھی بیا واپس چلی گئیں تھیں کھانے کے کمرے سے مجھے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آرہی تھی میں آج ایک خوبصورت منظر کا حصہ نہیں بن سکی تھی گھر کے سب افراد کھانے پر ہوں یہ

ایک ایسا لینڈ اسکیپ ہے جو میرے ذہن کے کینوس پر بہت خوبصورت رنگوں کے ساتھ ابھرتا تھا۔

ماما کی اونچی آواز ایک بار میرے کانوں میں آئی تھی۔

”بیا بیا آپ نے ہی اس کے خنجرے اٹھا کر اسے بگاڑ دیا ہے۔“

شاید نہیں یقیناً ممانے میرے متعلق کہا ہے اور کیا میں بگڑی ہوئی تھی۔ میں نے

جیسی عورتوں سے دور رہے وہ تو اتنی معصوم سی ہے اسے کیا پتا اور آپ تو جانتے ہیں پتا کہ وہ کیسی عورت ہے اور اخباروں میں اس کے متعلق کیا چھپتا رہتا تھا گو کہ وہ ہر اس کیئرڈل سے خود کو صاف بچا لیتی ہے۔“

میں بات کرتے کرتے پتا کے پاس ہی کارپنٹ پر بیٹھ گئی تھی اور میں نے اپنے ہاتھ پتا کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔ گہری سوچ میں ڈوبے بہت دھیان سے مجھے سنتے ہوئے پتا ایک دم چونکے تھے۔

”ہاں تم نے صحیح کیا تھا سو ہی اور تم بڑی ہونا تمہیں ہی رومی کا خیال رکھنا ہے ہر برائی سے روکنا ہے تمہاری ماما تو اتنی مصروف رہتی ہیں کہ ان کے پاس تو کسی کے لیے وقت ہی نہیں حتیٰ کہ ریان کے لیے بھی نہیں۔“ ان کے لہجے میں افسردگی تھی پھر وہ یکدم چونکے تھے۔

”اور یہ حسان کون ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

”پتا! حسان میرے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔“ اب میں حسان کے متعلق بتا رہی تھی ہر وہ بات جو میں جانتی تھی اور پتا کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

”پتا وہ کہتا ہے ہمارا معاشرہ سڑ رہا ہے اس میں بسا نہ پیدا ہو گئی ہے اس لیے کہ لوگوں نے صرف جسموں کو دیکھا شروع کر دیا ہے اور روح میں جھانکنا چھوڑ دیا ہے اس لیے روحوں کو طرح طرح کے آزار چھٹ گئے ہیں اور کوئی ان آزاروں کا علاج نہیں کرتا کسی کو رشوت کی بیماری ہے اور کسی کو ہوس چاٹ رہی ہے کسی کو اعلیٰ عہدوں اور بڑی سیٹوں کی ٹی بی ہو گئی ہے۔

پتا کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ ابھری۔ ”کسی دن حسان سے ملو آؤ نا، ویسے اس کے ڈیڈی سے تو اچھی سلام دعا ہے میری۔“ پھر وہ مجھے نہ سوچنے اور دودھ پی لینے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے تھے جو ابھی ابھی جیناں ٹیبل پر رکھ کر گئی تھی میں نے ٹرے پر نظر ڈالی تھی دو سینڈوچ بھی پڑے تھے میرے پسندیدہ چکن سینڈوچ، جو یقیناً تینا نے اپنے ہاتھ سے

بنائے ہوں گے میرا دل بیا کی محبت پر سرشار ہو گیا پتا کے ہاتھوں کا شفیق لمس ابھی بھی مجھے اپنے سر پر محسوس ہو رہا تھا جو جاتے جاتے انہوں نے میرے سر پر رکھا تھا۔

”تم میری بہت کجھدار اور پیاری بیٹی ہو مجھے تم پر فخر ہے۔“ لفظ اچلے موتیوں کی طرح میری روح کو شانت کر گئے ابھی میں کمرے کے وسط میں کھڑی تھی کہ رومی چپکے سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی اور اتنے ہی چپکے سے اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔

”یہ بروسٹ ہے۔ پتا نے باہر سے منگوایا ہے ایک نیارے ٹورنٹ کھلا ہے بہت اچھا ہے۔ کھا کر دیکھو نا۔“ اس نے پلیٹیں سائڈ ٹیبل پر رکھ دیں تھیں اور یہ کھیر ہے تمہیں پسند ہے نا میں تھوڑی سی لے آئی ہوں۔“ اس نے بالکل اسی انداز میں آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔

”اور ہاں دروازہ بند نہ کرنا۔ ماما سو گئی تو میں آ جاؤں گی۔“ جب سے وہ الگ کمرے میں گئی تھی صرف چند ہی راتیں ایسی تھیں جب وہ وہاں سوئی تھی میں عجیب سے احساسات میں گہری کھڑی ٹیبل پر رکھے ہوئے دودھ، سینڈوچ، بروسٹ اور کھیر کو دیکھ رہی تھی جب آہٹ پر میں نے مڑ کر دیکھا دروازے پر اونچا لہار یاں کھڑا تھا۔

”تمہاری طبیعت خراب ہے۔ تمہیں کیا ہوا ہے سو؟“ اس کے چہرے پر اجنبیت تھی لفظ بھی اپنائیت سے خالی تھے لیکن میں نے اپنائیت کی گری سے محروم ان لفظوں میں اس کا دل دھڑکتا محسوس کیا میں نے اس محبت کو ان سپاٹ لفظوں سے جھانکنے پایا جو بظاہر کہیں نہیں تھی نہ اس کی آنکھوں کے خالی پن میں نہ چہرے کے سپاٹ انداز میں نہ لہجے میں۔

”مجھے تھوڑا سا لگو ہو گیا تھا، آ جاؤ نا۔“

”نہیں میں اب سونے لگا ہوں۔ ٹیک کیئر!“ وہ اسی طرح واپس پلٹ گیا لیکن میرا دل جیسے میرا اب ہو رہا تھا ابھی کچھ دیر پہلے جو یکا یک اندر صحرا اُگ آیا تھا اب وہاں بھی

کے مخصوص پھلے پھلے ٹیسٹ سے الگ اور کبیر بھی بہت اچھی ہے اور سینڈوچ کا تو جواب ہی نہیں کسی نے سچ ہی کہا بھوک زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی بھوک ہو دولت کی، شہرت کی یا پیٹ کی بھوک، جو بھوک بھی آدمی کو گھیر لے اس میں لپٹ کر وہ سب بھول جاتا ہے۔

رات میں بہت دیر سے سوئی تھی اس لیے صبح یونورسٹی جانا میں نے کینسل کر دیا تھا رومی کو بس دو دن اور مزید کالج جانا تھا اور میں دونوں دن ڈرائیور کے ساتھ ہی رومی کو لینے اور چھوڑنے گئی تھی لیکن اگلے تین دن بھی میں یونورسٹی نہیں گئی تھی مجھے کھوج سی لگ گئی تھی میں جاننا چاہتی تھی میں کون ہوں بیا کچھ بتانے کو تیار نہ تھیں اور باقی سب صحیح تھا کہیں بھی کوئی جھول نہیں تھا سب واضح اور صاف تھا لیکن ماما کے لفظ ان کی نظریں ان کا رویہ کہیں کوئی کڑی ضرورت ٹوٹی ہوئی اور گمشدہ تھی جسے مجھے کھوجنا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح میں اپنی اس کوشش میں ناکام رہی تھی ماما اسلام آباد چلی گئی تھیں اس دفعہ پاپا بھی ان کے ساتھ گئے تھے شاید وہاں ان کا اپنا کوئی کام ہوگا۔ میں نے ماما پاپا کے بیڈروم کو کھنگال ڈالا کہیں کوئی سراغ نہ ملا تھا ماما کی دراز میں میرے بچپن کی ڈھیر دن تصویریں ایک چھوٹی الیم میں مل گئیں تھیں ایک دن سے لے کر پانچ سال کی عمر کی تصویریں۔۔۔۔۔ مجھے ادھر ادھر مختلف درازوں سے مل گئی تھیں میری سالگرہ کی تصویریں۔۔۔۔۔ میں ماما کی گود میں تھی اور پاپا میرا ہاتھ پکڑے ایک کنوارا ہے تھے میں ایک بار پھر یقین کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ مجھے یہاں ہی اسی گھر میں ہونا تھا اور یہ کہ کچھ مائیں ہوتی ہیں ایسی جو سب بچوں سے یکساں پیار نہیں کرتیں پھر پاپا کے کاغذات میں سے مجھے اپنا برتھ ڈیٹ مل گیا شاید مجھے اسی کی تلاش تھی اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے میرے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے ایک لمحہ کے لیے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کتنے ہی لمحے پونہی گزر گئے پھر میں نے آنکھیں کھولیں اور ڈرتے ڈرتے ٹھٹھکیٹ پر نظر ڈالی سمیہ احمد ولدیت کے خانے میں فصیح احمد جگمگا رہا تھا یہ نام اتنا روشن اور اتنا چمکدار مجھے کبھی نہیں لگا تھا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نام سے سورج کی

نخلستان تھے۔ بیتی ندیاں تھیں پانی کے جھرنے تھے دور تک کہیں کوئی تشنگی نہ تھی۔

”یہ میرا شہر محبت ہے۔“ میں گنگنائی۔ یہاں محبت کی فصل اگتی ہے اور یہاں کبھی کسی نے نفرت کاشت نہیں کی۔ میرا جی چاہا کہ رومی آجائے اور ہم دونوں بہت پہلے کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اونچی آواز میں سارے گھر میں گاتے پھریں برآمدے میں لاؤنج میں، لان میں ہر جگہ ”یہ میرا شہر محبت ہے“ اس شہر کے باسی سب اک پھول کی پتیاں ہیں اک بار کی لڑیاں ہیں، میں لگاتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے مجھے بالکل بھوک نہیں محسوس ہو رہی تھی لیکن اب میں بہت رغبت سے یوں کھا رہی تھی جیسے نہ جانے کب سے بھوکی ہوں۔ جب کبل دائیں بازو پر ڈالے رومی میرے کمرے میں آئی تو میں بروسٹ سینڈوچ سب کھا کر اب کبیر کھا رہی تھی۔

”مجھے پتا تھا تمہیں بھوک لگی ہوئی ہوگی۔“ رومی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ”اور تم ناراض تھیں نا اس لیے تم نے کچھ نہیں کھایا، پتا ہے میں سارا دن بہت پریشان رہی ہوں اور مجھ سے بالکل پڑھا نہیں گیا۔“ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اور سوئی اب کبھی تم ناراض مت ہونا مجھ سے۔“

”لیکن میں تجھ سے ناراض تو نہیں تھی چندا!“

”لیکن مجھے لگا تھا کہ تم مجھ سے ناراض ہو اور پردوس کہ اب میں ہر بات تمہیں بتاؤں گی اور یہ بھی میں نے تم سے چھپایا نہیں تھا بس مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا یا شاید مجھے اہم ہی نہیں لگا تھا لیکن آج میں نے تمہیں بتانا تھا کہ ناز و آپی نے کہا کہ میں گھر سے پوچھ آؤں تو کسی روز وہ مجھے اپنے گھر لے جائیں گی اور مجھے کیا پتا تھا وہ اتنی گندی عورت ہے۔“

”اُس اوکے رومی، میری بھی غلطی تھی نایوں ڈانٹنا شرع کر دیا۔“ میں نے اسے گلے لگا لیا وہ جلد ہی مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ میں اپنے بیڈ پر آئی تو میرا دل جیسے صحرا بن گیا اور سامعوں میں ماما کے لفظ زندہ ہو گئے ابھی جب میں کھا رہی تھی تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ بروسٹ واقعی ٹیسٹی ہے ایک منفرد سائٹ ہے۔ کے ایف سی

کرمیں پھوٹ رہی ہوں یہ سورج میرے نام کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور مجھے بھی روشن کر رہا تھا۔ سرٹیفکیٹ پر ماں کا نام نہیں تھا۔ کاش یورپ کی طرح یہاں بھی ماں کا نام ہوتا تو میرے یقین پر مہر لگ جاتی۔ ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں خود کو وطن طعن کر رہی تھی۔ جائے پیدائش عزیز ہاسپٹل لاہور، یہ پرائیویٹ ہاسپٹل تھا کافی مہنگا اور یہاں صرف امرا ہی جاتے تھے۔ یہ کہ میں کسی چوکیدار یا ملازم کی بیٹی نہ تھی میں نے برتھ سرٹیفکیٹ فائل میں رکھا تھا اور میرے اوپر جیسے پھوار برسے لگی تھی ایک بار پھر میں اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ماما بھی بس۔۔۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ بیا کے آرام کا وقت تھا رومی اپنے ہی کمرے میں پڑھ رہی تھی اس کے پیچھے چند دنوں میں ہونے والے تھے وہ بہت محنت کر رہی تھی میں چپکے سے ان کے بیڈروم کو بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور اگلی صبح میں پورے ایک ہفتے بعد یونیورسٹی گئی تو حسان مجھے ڈیپارٹمنٹ کے باہر علی مل گیا وہ جتنی تیزی سے میری طرف بڑھا تھا اس نے مجھے ایک لمحہ کے لیے حیران کر دیا۔

”کہاں گئی تھی تم اتنے دنوں سے اور یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہی تھی۔ رومی کیسی ہے؟ ٹھیک ہے نا وہ۔ ناظمہ شیرازی نے تو۔۔۔“ وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا مجھے اس کا یہ خلوص اچھا لگا تھا۔ وہ رومی کے لیے پریشان تھا۔

”ہاں رومی ٹھیک ہے۔ گھر پر رہ کر پڑھائی کر رہی ہے اس کا ارادہ بھی میری طرح ٹاپ کرنے کا ہے اور وہ کر لے گی مجھے یقین ہے کیونکہ اس نے ہمیشہ وہی کیا جو ہلن نے کیا ہے۔“ میرے لمبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں اتنا پریشان تھا کہ کہیں خدا نخواستہ ناظمہ شیرازی نے رومی کو۔۔۔ ادا گاڈ۔“ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا مکہ بنا کر بائیں ہاتھ پر مارا۔ ”میں نے تو کتنے ہی چکر رومی کے کالج لگا ڈالے تھے اور سوچ لیا تھا کہ خدا نخواستہ اگر ناظمہ شیرازی نے رومی کے ساتھ کوئی چالاک کی تو میں اسے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا پاتال سے بھی کھینچ نکالوں گا اسے۔۔۔ اور

میں نے اس کے خلاف ثبوت بھی ڈھونڈنے شروع کر دیے تھے۔“

”حسان تم بھی بس۔“ میں بے اختیار ہنس دی تھی اور وہ مہبوت ہو کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔

”میں نے رومی کو سب سمجھا دیا ہے۔ دراصل ناظمہ شیرازی کی کوئی کزن پڑھتی ہے نا وہاں۔۔۔۔۔“

”کوئی کزن وزن نہیں اس کی، یہ سب ساقھی لڑکیاں ہیں اس کی۔ معصوم لڑکیوں کو پھنسانے کے لیے سکولوں اور کالجوں میں داخل کروا رکھی ہیں اس نے۔۔۔ اور یہ ہماری حکومت آنکھیں بند کر لیتی ہے ایسے لوگوں کے متعلق ایک کان سے سن کر دوسرے کان اڑا دیتی ہے۔“

”حسان تم کیوں نہیں سیاست میں چلے جاتے کسی اونچی سیٹ پر بیٹھ کر ایسے سب لوگوں کا تپا پانی بچہ کر دیتا۔“ میں نے شرارت سے اسے دیکھا تو وہ جھلا گیا۔

”میں اندھا گونگا بہرہ چور بے حس اور ظالم نہیں ہوں سمجھیں، آئندہ یہ مشورہ کسی ایسے بندے کو دینا جس کے سینے میں دل نہیں پتھر دھڑکتا ہو جو انسان نہیں صرف سیاست دان ہو۔“

میں ایک بار پھر ہنس دی۔ ”پتھر نہیں دھڑکتے۔“

”ہنسومت اور یہ بتاؤ پورا ہفتہ کیوں غائب رہیں تم جانتی ہو کتنے اہم لیکچرز تھے سرفیاض کے اور فیل ہوتا ہے تمہیں۔۔۔ چھٹیاں کرنے کا اتنا شوق ہے تو یونیورسٹی میں کیوں آئی کبھی گھر ہی بیٹھی رہتیں۔“

وہ مجھے ڈانٹ رہا تھا اور میں سر جھکائے سن رہی تھی اور اس کا ڈانٹنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ بہت ہی اچھا۔ پھر بہت سارے دن سرخوشی اور مدہوشی میں گزر گئے۔ رومی کے پیچھے ہوئے پھر میں اپنی پڑھائی میں بے حد معروف تھی پھر بھی دل کے کسی کونے میں یہ احساس موجود تھا کہ میرے سارے خوف بے معنی اور بے بنیاد تھے وہ ایک یقین کا دیا جو

کافد کے ننھے سے ننھے سے میرے ہاتھ لگا تھا میرا اندر جلتا ہو رشتیاں پھیلا رہا تھا اور اس روشنی میں موسموں کے سارے اندھیرے غائب ہو گئے تھے کبھی کبھی پڑھائی سے تھک کر میں کتابوں سے سر اٹھاتی تو میرا جی چاہتا میں دونوں ہاتھ پھیلائے اپنے شہر محبت میں دوڑتی پھروں اور اس کی خوشبو میں اپنے اندر اتار لوں۔ یہ میرا اپنا شہر محبت تھا جس میں محبتوں بھری خوش دل ہوائیں چلتی تھیں اور وہ جو کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ یہ ہوائیں بوجھل اور بے بو ہیں تو یہ میرے اپنے ذہن کا فتور تھا اور کچھ نہیں۔۔۔ جس روز میرے پیپر زخم ہوئے میں خوب لمبی تان کر سوئی۔ شام کو جب میری آنکھ کھلی تو باہر ملجگا سا اندھیرا تھا اور روی میرے ہی کمرے میں دوسرے بیڈ پر بیٹھی کچھ پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”او جھنکس سوئی تمہارے پیپر زخم ہوئے۔ میں بے حد بور ہو رہی تھی۔“

”تو اس بوریت کا کیا علاج ہے؟“ میں جو سونے سے بہت فریش ہو گئی تھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”چلوئی وی لاؤنج میں جا کر کوئی اچھا سا موڈی چینل دیکھتے ہیں۔“ اس نے خوش

ہو کر کہا۔

”باہر نہ چلیں کہیں گھومنے۔“

”Realy سوئی!“ اس کی آنکھوں میں حیرت بھری خوشی تھی۔

”تم قافٹ تیار ہو جاؤ، میں ریان کو بھی کہتی ہوں ہم تینوں چلیں گے گھومنے شالامار، مقبرہ جہانگیر، شاہی قلعہ یا کہیں بھی۔“ میں نے فوراً پروگرام بنا ڈالا۔ روی کی آنکھوں میں پھر حیرت نمودار ہو کر خوشی میں تبدیل ہو گئی وہ اچھل کر بیڈ سے اتری۔

”میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“

کیا تم کبھی مقبرہ جہانگیر یا شالامار گئی ہو؟“ میں پیپر دے کر باہر نکلی تو درخت سے

فیک لگائے حسان کھڑا تھا۔

”شاید بچپن میں جب میں سکول پڑھتی تھی ٹیچرز کے ساتھ گئے تھے۔ پتا تو بہت

موڈ میں ہوتے ہیں تو کبھی میکڈونلڈ یا کے ایف سی لے جاتے ہیں یا بہت ہوا تو ایک دو بار فورٹس سٹیڈیم لے گئے تھے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ مجھے ہنسی آئی۔ حسان کی عادت تھی یونہی کسی بے تکی سی بات سے بات کا آغاز کرتا تھا۔

”یونہی آدمی کو اپنی تاریخ نہیں بھلائی چاہیے اور کبھی کبھی ماضی کے کھنڈرات پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے۔“

”تو یہ رکھا ہی کیا ہے ان سڑی بسی تاریخی عمارتوں میں۔ مرنے والے مر گئے چلو انہوں نے اپنے زمانے میں شاندار عمارتیں بنوائی ہوں گی لیکن اب۔“

یہ تائید تھی جو میرے ساتھ ہی کمرہ استھان سے باہر نکلی تھی۔

”اللہ کی قسم“

یہ اس کا کلیہ کلام تھا۔ ”میرے چاچا کے سالے کا گھر دیکھو تو آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ شاہی قلعہ اس کے سامنے کیا چیز ہے۔“

”لوگوں کو اپنی تاریخ یاد رکھنی چاہیے۔“

یہ حسان تھا جو اسی طرح فیک لگائے کھڑا تھا۔

”جو تو میں اپنے ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتی اور اچھائیوں کو اپناتی نہیں وہ جلد ہی زوال کا شکار ہو جاتی ہیں اس لیے مائی ڈیر تائید ماضی سے کبھی واسطہ نہیں توڑنا چاہیے اور تمہیں کیا پتا ان تاریخی عمارتوں میں کتنی کشش اور اسرار ہوتا ہے۔ ویسے کتنا رومینک لگتا ہے نا وہاں جا کر کسی کو نے میں بیٹھ کر باتیں کرنا۔“ وہ اب مجھے دیکھ رہا تھا۔

”پتا ہے سمعیہ ایک وقت میں جب میں کالج پڑھتا تھا تو میں اکثر مقبرہ جہانگیر چلا جاتا تھا بڑی عبرت ہوتی تھی ایک عجیب سا احساس لپیٹ میں لے لیتا تھا کہ یہ لوگ جو تہہ خاک پڑے ہیں کبھی ان کے نام سے لوگ کا بننے ہوں گے۔ میں ایک طرف اکیلا بیٹھ جاتا تھا اور کہیں کسی درخت کے پاس بیٹھ کر کوئی نہ کوئی جوڑا دم سرگوشیاں کر رہا ہوتا تو میں سوچتا تھا کبھی میں بھی یہاں کسی درخت تلے بیٹھ کر کسی پیاری لڑکی سے سرگوشیاں کروں تو کتنا

رومیٹک لگے گا۔ ہیں نا۔“

میں اس کی بے تکی باتوں پر بے ساختہ ہنس دی۔
”تم جانا کسی دن مقبرہ جہانگیر اور شالامار۔“

میں نے حسان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اب ریان کی کمرے کی طرف جاتی ہوئی میں سوچ رہی تھی کیا میں حسان کی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہوں کہ اس کی بے تکی باتوں کو بھی یاد رکھتی ہوں اور شاید آج کے بعد حسان سے کبھی ملاقات نہ ہو یا شاید کبھی ہو بھی جائے میں نے سوچتے ہوئے ریان کا دروازہ کھولا اندر سگریٹ کی Smell اور دھواں تھا اور ریان آنکھیں موندے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

”ریان!“

میں ششدری لمحہ بھر اس کے سامنے کھڑی دیکھتی رہی ریان نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ اور کب سے؟“ میرے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ نکلے
”ہاں یہ۔۔۔ بس ایسے ہی۔“

ریان نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سگریٹ کو دیکھا اور اسے الٹ کرے میں پھینک دیا الٹ کرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر اہوا تھا۔

یہ کیا ہو گیا تھا اور کب ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور پتا نہیں کب سے وہ سگریٹ پی رہا تھا میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔ اور یہ سگریٹ، اف۔ او۔۔ اس کی صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہیں ممانے اسے اتنا اپنے قریب کر کے اتنا اکیلا کر دیا تھا تھا چھوڑ دیا تھا اور ہم نے بھی اس کا خیال نہیں کیا سوچا نہیں اس کے متعلق ہم میں سے کسی نے بھی نہیں۔ ہاں وہ سکول سے آکر اکیڈمی چلا جاتا تھا اور پھر اکیڈمی سے کہاں ہم نے کبھی پوچھا نہیں تھا اور مجھے ممانے ایک بار کہا تھا جب وہ اسے سکول چھوڑنے گئی تھیں کہ میں یہاں نہیں ہوں گی اور تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے تم بڑی بہن ہو اس کی اور ماما یہاں نہیں تھیں پتا بھی دیر سے

آتے تھے اور میں نے اف میں نے بھی اس کا خیال نہیں رکھا ریان نے ٹیبل سے سگریٹ کی ڈپیا اٹھا کر سگریٹ نکالا شاید وہ ایک اور سگریٹ پینا چاہتا تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں میرے بھائی نہیں۔۔۔“ میں نے یکدم لپک کر اس کے ہاتھ سے ڈپیا چھین لی اور وہیں کارپٹ پر دوڑانوں بیٹھ گئی میں کیا کہنا چاہتی تھی کیا کہنا تھا مجھے کچھ پتا نہیں تھا میں بس اس کا ہاتھ تھا مے انہیں چوم رہی تھی اور رو رہی تھی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔ مت کرو ایسا تمہیں پتا ہے نا تمہیں۔ اوہ نہیں رانو میرے بھائی میرے جان میری زندگی۔“

وہ ساکت بیٹھا خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”وعدہ کرو۔۔۔ وعدہ کرو سگریٹ پینا چھوڑ دو گے۔ کہاں رہتے ہو کن دوستوں کے پاس رہتے ہو۔ کیسے ہیں وہ!“ میرے الفاظ میں ربط نہیں تھا لیکن میں بول رہی تھی رو رہی تھی مجھے خود علم نہیں تھا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا میرے اندر سے اس کے لیے محبت کیسے پھوٹ پڑی تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں کو جنش ہوئی اس کی لرزتی انگلیوں کو میں نے اپنے رخساروں پر محسوس کیا۔

”مت رو سو می!“

وہ میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔

”میں کوشش کروں گا۔“

”رانو۔۔۔ میرے بھائی!“

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اب میں اس کے خوبصورت بالوں والے سر کو چوم رہی تھی اسکے آئینے پر ضرب پڑی تھی اور وہ نرم ہو رہا تھا میں سمجھ گئی تھی کہ وہ ماما کے بعد اکیلا ہو گیا تھا ماما تو اسلام آباد سے آکر بھی اسے وقت نہیں دے سکی تھیں میں اب اسے تنہا نہیں چھوڑوں گی میں خود سے عہد کر رہی تھی میرے رخساروں پر اب بھی آنسو بہہ رہے تھے جب رومی تیار ہو کر ریان کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھر حیران سی دروازے کے پاس ہی

کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“

اس کے لبوں سے کانپتی ہوئی آواز نکلی اس کا چمکتا ہوا چہرہ یکدم بے رنگ ہو گیا تھا
”کیوں رو رہی ہو اور ریاں کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”کیا تم لوگ کہیں جا رہے تھے؟“ ریاں نے رومی سے پوچھا تو میں نے اسے
بتایا کہ میں اسے ہی لینے آئی تھی ہم نے گھومنے کا پروگرام بنایا تھا ہم نے سوچا تھا آج تاریخی
عمارت کی سیر کریں گے دیکھو نا ہم یہاں لاہور میں رہتے ہیں اور ہم ایک بار بھی ان جگہوں
پر نہیں گئے سوائے سکول کی ٹیچرز کے ساتھ ایک تعلیمی ٹرپ پر جانے کے۔“

”تو چلو!“

شاید اس نے رومی کی آنکھوں میں چراغوں کو جھٹکے دیکھ لیا تھا اور پھر ہم نے بیا کو
بھی ساتھ لے لیا تھا بیا کی تو عادت تھی کہ انہوں نے کبھی ہماری بات نہیں مانی تھی ہم شالامار
گارڈن گئے تھے حسان نے سچ کہا تھا یہاں ایک اسرار تھا ایک سحر تھا جو اپنی پلیٹ میں لے
لیتا تھا کبھی ان روشوں پر شہزادے شہزادیاں ٹپکتے تھے اور ان کے آگے پیچھے مور جھلنے
ہوں گے غلام اور باندیاں۔ حسان نے سچ ہی کہا تھا رومی اور ریاں کے چہروں پر بھی خوشی
کے رنگ تھے انہیں بھی اچھا لگ رہا تھا ہم نے کرارے چٹ پٹے چنے خریدے تھے کئی کے
بھٹے جو ریت کے بھوبھل میں رکھ کر تیار کیے گئے تھے کھائے اور خوب مزا آیا ایک جگہ سے
کوک پی اور بیا ہمارے ساتھ انجوائے کر رہی تھی میں بار بار ماضی میں کھو جاتی تھی شہنشاہ بار
پھر ہمایوں پھر اکبر، جہانگیر، شاہجہان اورنگ زیب وقت نے سب کو مٹا دیا پھر مجھے ایک جگہ
حسان نظر آیا وہ پانی میں ننگریاں پھینک رہا تھا۔

”حسان!“

اسے دیکھ کر میں نے بلند آواز میں پکارا وہ مسکرا دیا مجھے دیکھ کر وہ ڈرا بھی حیران

نہیں ہوا تھا۔

”مجھے پتا تھا کہ تم آؤ گی لیکن یہ نہیں پتا تھا آج ہی۔“

میری آنکھوں میں حیرت تھی۔

”کیا تم روز یہاں آتے ہو؟“

”نہیں سال میں ایک دو بار، میرے کچھ عزیز سرگودھا شہر سے آئے ہوئے ہیں

خاص طور پر لاہور کی سیر کرنے، ان کے ساتھ آیا ہوں۔“

”یہ ریاں میرا بھائی ہے اور یہ بیا میری خالہ ہیں۔“ میں حیرت کے سمندر سے نکلی
تو مجھے ان کا تعارف کرانے کا خیال آیا رومی کو تو جانتی ہی تھا اس روز ہم نے بہت انجوائے کیا
رومی، ریاں اور بیا کو اس نے اچھا خاصا مٹا کر کیا وہ بار بار اس کی باتوں پر حیران ہوتے جبکہ
میں تو جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے۔

ہم جب گھر پہنچے تو آٹھ بجتے والے تھے پتا بھی تک نہیں آئے تھے اور یہ پتا کی
روٹین ہی بن گئی تھی اب کبھی دس بجے بارہ بجے آتا۔

”ریاں اگلے ماہ جون میں تمہارے پیچھے ہو رہے ہیں تیاری کیسی
ہے؟“ میں نے کھانے کی ٹیبل پر پوچھا۔

”بس، سوو!“

اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”تمہیں اب پڑھائی پر زیادہ توجہ دینا چاہیے رانوا اتنے تھوڑے سے دن رہ گئے
ہیں اور اب تو میں بھی فارغ ہوں سب میں تو نہیں لیکن کچھ میں تو میں تمہاری ہیلپ کر سکتی
ہوں نا؟“ اس نے جواب نہیں دیا تھا اور چاول اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگا تھا گو ہم نے کافی
کچھ کھایا پیا پھر بھی جب جینے کھانا لگایا تو ہم بہت رغبت سے کھانے کی ٹیبل پر آ بیٹھے۔
رومی تھک گئی تھی اس لیے وہ جلد ہی سونے کے لیے چلی گئی تھی اور ریاں کی عادت ہی نہیں تھی
ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کی۔ جب سے ممانے اسلام آباد جانا شروع کیا تھا اور پتا گھر سے
عاجب رہنے لگے تھے وہ کبھی بھی ٹی وی لاؤنج میں میرے اور رومی کے ساتھ آکر نہیں بیٹھا تھا

شاید وہ دل میں ماسے ناراض تھا اور اس غصے کو سگریٹ کے دھواں میں زائل کرنا چاہتا تھا میں بہت دیر تک اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی اور جب نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور گھڑی کی سوئیاں ساڑے بارہ بج رہی تھیں گیٹ کھلنے کی آواز آئی میں نے لاؤنج میں ہی بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ پیا اپنے کمرے میں جا کر چھینچ کر چکے ہوں گے میں دستک دے کر ان کے کمرے میں چلی گئی وہ بیڈ پر ٹپکے سے ٹپک لگائے بیٹھے تھے انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر کلاک پر نظر ڈالی تقریباً ایک بج چکا تھا۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں سوئی اور تمہارا امتحان ہو گیا؟“

”آج لاسٹ پیپر تھا اور میں آپ کا انتظار کر رہی تھی مجھے آپ سے کچھ

کہنا تھا۔“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”کیا جیسا کا فون آیا تھا؟“

”نہیں!“

میں ان کے پاس ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی انہوں نے ٹانگیں سیٹ لی تھیں اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”مجھے ریان کے متعلق آپ سے بات کرنی تھی پیا آپ تو جانتے ہیں کہ ممانے اسے اپنے اتنے قریب رکھ کر پھر دور کرنے کی سزا کیوں دی ہے اور آپ نے بھی اسے انور کر دیا آپ اسے بالکل بھی ٹائم نہیں دیتے پیا۔“

اب میری آنکھیں برسنے لگی تھیں پتا نہیں کیوں مجھے اتنی جلدی رونا آجاتا تھا

”آپ کو پتا ہے وہ سگریٹ پینے لگا ہے اور پتا نہیں کب سے پی رہا ہے وہ اکیڈمی کے بعد نہ جانے کہاں کہاں، کن دوستوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے اور میری آواز گھٹ گئی پیا نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر کو سینے سے لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگے۔

”تھینک یو سوئی! میرے بچے مجھے پتا ہے تم بہت سمجھدار ہو اور تمہیں اپنے بہن بھائی کا خیال ہے۔ آئی ایم سوری جانو میں ریان کی طرف سے غافل ہو گیا تھا آئندہ ایسا

نہیں ہوگا میں خود چیک رکھوں گا اس پر، اس کی سٹڈی کا بھی خیال رکھوں گا اور شاہب اش اب رونا نہیں، جاؤ بہت رات ہو گئی ہے سو جاؤ۔“

”پیا آپ ریان سے سگریٹ کے متعلق کچھ مت پوچھئے گا وہ سمجھے گا میں نے آپ سے شکایت کی ہے اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ آئندہ سگریٹ نہیں پئے گا کیا ہوا پیا جو وہ اتنا لبا ہو گیا ہے۔ ہے تو وہ بچہ ہی نا۔“

”اوکے۔“ پیا نے سر ہلادیا تھا اور پھر جیسا پیا نے کہا تھا ایسا ہی ہوا تھا پیا سر شام ہی گھر آنے لگے اور ریان کو وقت دینے لگے اور میں۔۔۔۔۔۔ میں نے تو ریان کو اسی طرح حصار میں لے لیا تھا جس طرح سوی کو لیا تھا جب ممانے کو لے کر انگلینڈ گئی تھیں اور اب ریان کا بھی ایسے ہی خیال رکھنے لگی تھی صبح اس نے ناشتہ کیا رات کو دودھ پیا اس کے کپڑے استری ہوئے جوتے پالش ہوئے وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ میں نے ریان سے دوستی بھی کر لی تھی جب پڑھائی سے تھک جاتا تو ہم گھومنے نکل جاتے تھوڑی سی سیر سے موڈ اچھے ہو جاتے کبھی کبھی پیا بھی، پیا بھی ساتھ ہوتے اور کبھی ہم تینوں اکیلے۔ پھر ریان کے پیچہ ز شروع ہو گئے اور بقول اس کے، توقع سے زیادہ اچھے ہوئے۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے سوئی ورنہ میرا دل تو پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔“ ایک دن اس نے کہا تھا۔

زندگی میں کتنی خوشیاں تھیں بس کبھی کبھی ممانے کی بے تحاشہ محسوس ہوتی تھی اور کبھی ممانے آجائیں خوشیاں بڑھ جاتیں پہلے روی کا رزلٹ آیا پھر میرا اور آخر میں ریان کا۔ ریان نے بہت اچھے مارکس لیے تھے اور ممانے بے تحاشہ خوش تھیں اور اسی خوشی میں انہوں نے ایک زبردست پارٹی دے ڈالی اس روز ممانے روی اور ریان سے کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی بلا لیں لیکن ممانے مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی لیکن میں نے محسوس بھی نہیں کیا تھا کیا ہوا جو ممانے مجھ سے نہیں کہا تو میں خود بھی تو بلا سکتی ہوں لیکن میرا کوئی خاص دوست نہیں تھا حسان کا خیال کچھ دیر کو آیا تھا لیکن میرے پاس تو اس کا کوئی کنکٹ نمبر نہیں تھا

رومی نے بھی اپنی کسی فریڈ کو نہیں بلایا تھا۔

”ارے تم لوگوں نے اپنی فریڈز کو نہیں بلایا۔“

”میری کوئی خاص فریڈ نہیں ہے پیا اور پھر سوسی نے بھی تو کسی کو نہیں بلایا۔“

رومی نے جواب دیا تھا اس وقت میں نے مہما کے چہرے پر کچھ شکلیں نمودار ہوتے دیکھی تھیں لیکن میرے اندر یقین کا دیا جل رہا تھا اس نے مجھے Hurt نہیں ہونے دیا تھا میں بہت اعتماد کے ساتھ رومی اور ریان کے ساتھ سب سے مل رہی تھی۔

”یار اپنی بیٹیوں کے رشتے طے کرتے وقت ہمارے متعلق بھی سوچ لیتا۔“

اصفہانی مہما سے بات کرتے ہوئے مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی مہما نے اسے کیا کہا تھا میں نے سنا نہیں اس روز میں نے کئی نظریں خود پر پڑتی محسوس کی تھیں۔

اور پھر بہت سارے دن بیکار گزر گئے۔ رومی اور ریان اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے تھے ریان نے اے لیول کرنے کے بجائے ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا تھا کیونکہ اس کے دوستوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور مہما نے اسے مجبور نہیں کیا تھا اور میں بالکل فارغ اور بیکار اور ایسے ہی بیکار دونوں میں ایک دن حسان کا فون آیا۔

”ارے تم، حسان تمہیں میرا نمبر کیسے پتا چلا؟“ میں ایک دم خوش ہو گئی اس

بورلے میں جب بیا سوری تھیں۔ رومی اور ریان اپنے اپنے کالجز میں تھے اس کی آواز جیسے میرے اندر زندگی کی روح پھونک رہی تھی۔

”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے لڑکی۔“

اس کی آواز میں زندگی تھی۔

”کیا کر رہی ہو آج کل؟“

”کچھ نہیں۔“

”یعنی شادی کا انتظار۔“

”کہہ سکتے ہو۔“ میں ہنسی۔

”ایک ہاسپٹل میں انٹرن شپ مل رہی ہے، لینی ہے؟“

”وائے ناٹ، حسان میں بہت بور ہو رہی ہوں۔“

”اوکے تو پھر صبح آجاتا مینٹل ہاسپٹل۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا اور میں بے حد

خوش خوش بیٹا سے مشورہ کرنے چل دی تھی رات کو میں نے پپا سے بھی اجازت لے لی تھی اور پھر ہمیں وہاں انٹرن شپ مل گئی تھی میں جو سمجھتی تھی کہ میں سائیکا لوجی میں ماسٹر کرنے کے بعد نفسیاتی مریضوں کا علاج کرنے لگوں گی اور ڈاکٹر بن جاؤں گی مجھے اب پتا چلا تھا کہ اس طرح نہیں ہوتا۔ یہاں ڈاکٹر فرقان حیدر اور ڈاکٹر مصطفیٰ زیدی سیکا ٹرسٹ تھے اور یہ دونوں ہی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے ہمارا کام صرف یہ تھا کہ ہمیں مریضوں کی ہسٹری لیتا ہوتی تھی پھر ڈاکٹر مصطفیٰ یا ڈاکٹر فرقان ایک گھنٹہ لیکچر دیتے تھے اور ہمیں اس لیکچر میں دوائیوں کے متعلق بتایا جاتا تھا کہ کون سی دوا اور کس طرح کس مریض کو دینا چاہیے۔ کبھی کبھی مریضوں کی ہسٹری لینے کے علاوہ ہمیں تھراپی اپلائی کرنے کے لیے بھی کہا جاتا تھا جلد ہی مجھے یہ کام بہت دلچسپ لگنے لگا تھا بعض مریض تو بہت ہی اچھے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ انٹرن شپ صرف تین ماہ کے لیے تھی لیکن حسان چاہتا تھا کہ ہم چھ ماہ انٹرن شپ کر لیں اور پھر اس کے بعد ایک سال کا ڈپلومہ لے لیں کیونکہ اس کے بغیر نہ تو جواب آسانی سے مل سکتی تھی اور نہ ہی ہماری سائیکا لوجی کی ڈگری کچھ کارآمد تھی۔

”یعنی ایک سال اور پڑھنا پڑے گا۔“ نائید کا رنگ تو یوں پیلا پڑ گیا جیسے اسے

کوئی بہت دشوار کام بتا دیا گیا ہو۔“

”ہاں نائید بی بی ورنہ جاب نہیں ملے گی۔“

”نہ ملے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا تھا لیکن ڈپلومہ کورس میں داخلے کے لیے

سب سے پہلے فارم ویسی لے کر آئی تھی یہاں اس مینٹل ہاسپٹل میں ہمارے علاوہ بھی کچھ لڑکے لڑکیاں انٹرن شپ کر رہے تھے اور ہمیں دس ہزار روپے ماہوار مل رہے تھے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں سے بھی یہاں ہم چاروں اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں، نائید، حسان اور فرار۔

پہلے کبھی کبھی اس کی مداخلت مجھے ناگوار گزرتی تھی خصوصاً اس وقت جب وہ میری اور حسان کی گفتگو میں انٹرفیر کرتی تھی۔
 ”ہاں تم بھی کر لینا۔“

حسان اس وقت بڑا دیالو بن جاتا۔

”اور اپنی مرضی سے تنخواہ لے لیتا، تو میں کہہ رہا تھا اس مینٹل ہسپتال میں چار سیکاٹرسٹ ہوں گے دو نیروسرجن ہوں گے اور ہم چار سائیکالوجسٹ۔“
 ”اور ساری زندگی مریضوں کی کیس ہسٹری لکھتے رہیں گے، تف ہے ہم پر حسان۔“

فراز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

”یار آخر ہم نے سائیکالوجی کیوں پڑھی ہے، میں نے تو اس لیے پڑھی ہے کہ مجھے ڈاکٹر بننے سے چڑھتی۔“ حسان نے کہا۔

”لیکن چور چوری سے چلا جائے ہیرا بھیری سے نہیں جاتا۔“ یہ تائید تھی۔

”آخر کار تم بھی ایک ہسپتال بنانے کا خواب دیکھ رہے ہو نا یعنی کان ادھر سے کھڑو یا ادھر سے، اس سے اچھا تھا کہ تم ڈاکٹر ہی بن جاتے اور وہی مریضوں کا علاج کرتے رہتے۔“

”ہاں یا راب تو یہی سوچتا ہوں لیکن تب مجھے اتنی چڑھتی نا ڈاکٹر بننے سے کہ کوئی مجھے کروڑوں روپے بھی دیتا تو نہ بنتا۔ ان دنوں تو گھر بھی مجھے ہسپتال ہی لگتا تھا بڑے بھائی ڈاکٹر، چھوٹے بھائی ڈاکٹر، بجوڈاکٹر، ماما ڈاکٹر، چچا ڈاکٹر۔“

”اف او۔۔“

تائید نے کان پر ہاتھ رکھ لیے۔

”تم شروع ہو جاؤ تو بس۔۔ تم بتاؤ فراز تم کیوں اس مضمون میں جھک مارنے آئے تھے؟“

تھے وہ کالج کی طالبہ تھی جس پر اس کی سوتیلی ماں نے جھوٹے الزام لگائے تھے اور اس کا ذہن ان الزامات کو برداشت نہ کر سکا تھا) لیکن ہمارے سمیعہ پاپا ہنسے گئے۔“
 ”پاگل ہو گئے ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔“

میں نے اپنا نکتہ نظر کئی بار ان پر واضح کیا لیکن وہ میری بات سمجھتے نہیں۔ یہ زمین میرے دادا کے زمانے کی ہے اور بیکار پڑی ہے۔ ایک بار ایک شخص نے یہاں تو لیے بتانے کے لیے فیکٹری لگانے کے خیال سے یہ زمین خریدنی چاہی پھر پتا نہیں کیا ہوا اس کا ارادہ بدل گیا پھر ایک شخص نے یہاں پولٹری فارم بنایا لیکن پھر غالباً فارم خالی کر دیا۔ میں نے پاپا سے یہاں تک کہا ہے کہ وہ مجھے کسی بھی جائیداد سے کچھ نہ دیں بس یہ زمین دے دیں۔ میں آدھی زمین فروخت کر کے اس پیسے سے باقی آدھی زمین پر ہسپتال بنواؤں گا لیکن پاپا۔۔۔“

”تو تم اس لیے گھر چھوڑ آئے ہو؟“

میں نے پوچھا۔

”ہاں اگر پاپا میری بات نہیں مانتے تو مجھے بھی۔۔۔“

ان دنوں وہ اس ہسپتال کے بہت خواب دیکھنے لگا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اس کی باتیں کرتا رہتا۔

”ہمارے وہاں ہم ان مریضوں کو خوبصورت ماحول دیں گے بہت محبت بھرا۔ سمیعہ تم بھی میرے ہسپتال میں جاب کرنا میں بہت اچھی تنخواہ دوں گا تمہیں۔“

”شیخ جلی صاحب ابھی سے طے کر لیں کتنی Pay دیں گے تو میں بھی اس پیش کش پر سوچ سکتی ہوں۔“

تائید ضرور ہماری باتوں میں کوو پڑتی تھی لیکن اب میں اس کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی کیوں کہ اب میرے دل کا ایک گوشہ اس کے لیے بہت گداز اور نرم رہتا تھا حالانکہ

”جی بات تو یہ ہے کہ میں دوبار انٹری ٹیسٹ ٹرائی کرنے کے باوجود ناکام ہو گیا تھا تو دل برداشتہ ہو کر کالج میں ایڈمشن لینے گیا تو ایک دوست کو دیکھ کر یہی مضامین فارم میں لکھ دیے۔“

”اور میں نے بھی تائید کی دیکھا دیکھی یہ مضامین لیے تھے۔“ میں نے فوراً کہا۔
 ”اور تائید تم کیوں ادھر جھک مارنے آئی تھی؟“ حسان نے اسی کی بات لوٹائی۔
 ”میں“

تائید نے سر جھکا لیا۔

”بس یونی میں نے کالج کے پرائیکٹس کو دیکھا تو یہی مضامین سب سے آسان لگے تھے کیونکہ سٹری کے ساتھ سوس اور اسلامیات کا کنبینھن تھا جو مجھے سخت زہر لگتے تھے۔ فارسی کے ساتھ جغرافیہ اور جرنلزم تھے۔ بس یہی لے لیے کم از کم ان مضامین سے کوئی پرانی دشمنی نہیں تھی۔“

ہم یونی اٹنی سیدھی باتوں میں وقت پاس کرتے تھے پھر چھ ماہ کی انٹرن شپ کے بعد ہم نے داخلہ لے لیا۔ یہ ایک سال کا کورس تھا اور یہ دن بھی میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھے۔ ہم چاروں میں دوستی کا بڑا پر خلوص سا بندھن بند گیا تھا اور ان ہی دنوں روی اپنے ایف اے کے ایگزام سے فارغ ہو کر پورہوری تھی اور میرے کورس کے ختم ہونے میں چند ہی دن رہتے تھے کہ امریکہ سے اچانک فیضان اور ماموں آ گئے۔

بیا اور ماما بہت خوش تھیں، کتنے ہی سالوں بعد ان کا بھائی آیا تھا۔ فیضان نجیب ماموں کا بیٹا تھا اور بہت ہی دلچسپ شخصیت کا مالک۔ وہ ایم بی اے کر چکا تھا اور ماموں کے ساتھ کمپنی میں ہی کام کرتا تھا۔ ماموں دراصل پاکستان میں بزنس کے امکانات دیکھنے آئے تھے۔ ماما ان دنوں خلاف معمول گھر پر تھیں اور بہت دنوں سے اسلام آباد نہیں گئیں تھیں تب ہی ایک رات ڈنر ٹیبل پر ریان نے شرارت سے ماما کی طرف دیکھا تھا۔

”ماما کیا آج کل اسمبلی کے اجلاس نہیں ہو رہے یا اسمبلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔“

اور اس کی شرارت سمجھتے ہوئے ماما بس وی۔

”میرا بھائی اور بھتیجا اتنے سالوں بعد آئے ہیں میں انہیں چھوڑ کر چلی جاؤں۔“
 جب ریان نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس لے کر فیضان کی طرف دیکھا تھا۔
 ”فیضی بھائی آپ بڑے کلی ہیں۔“

سب ہی ہنس دیے تھے لیکن میں نے اس کا درد اپنے دل میں محسوس کیا تھا جو ماما کے اس طرح اسے تنہا کر دینے پر اس کے اندر اتر آیا تھا۔ میری نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں گو وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ان کے ہلکوں کا درد چل رہا تھا۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ فوراً پلیٹ پر جھک گیا گوا سے ماما سے شکوہ تھا پھر بھی ماما کے اس طرح گھر پر رہنے سے ہم سب ہی بے حد خوش تھے۔ پھر ماموں چلے گئے لیکن فیضان یہیں رک گیا تھا۔
 ”ڈیڈ ابھی میں یہیں رہوں گا۔ مجھے ابھی اپنے وطن کی ہواؤں کو محسوس کرنا ہے۔“
 آف اوڈیڈ میں نے کتنا عرصہ ان خوبصورت فضاؤں سے محروم گزار دیا۔“

”تم چاہو تو یہاں بزنس سیٹ کر لو اور شادی کے بعد یہاں ہی سٹیل ہو جاؤ پھر ہم بھی سوچیں گے۔“

ماموں نے اسے فراخ دلی سے اجازت دے دی تھی دراصل وہاں کے ماحول سے وہ خود بھی اب اپنا سیٹ ہو چکے تھے وہاں بہت کرپشن ہے اتنی کہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا بچے اپنے ہی والدین کے گھر محفوظ نہیں رہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچے ایسے ہیں جو اپنے فاسر والدین کے پاس پلٹے بڑھتے ہیں۔ ایک روز ماموں نے بتایا تھا۔

”اور ہمارے لیے وہاں کتنی انٹرکیش ہے ہم سب کم و بیش وہاں ہی سٹیل ہونا چاہتے ہیں۔“

جب میں نے حسان، فرازا اور تائید کو سب بتایا تو حسان نے تبصرہ کیا تھا۔
 ”شاید ڈالروں کی چمک اتنی چندھیا دینے والی ہوتی ہے کہ اس معاشرے کی برائیاں اس چمک میں نظر ہی نہیں آتیں۔“

بیانے سر ہلایا۔

”اگر آپ کہیں تو میں یہاں ہی سو جاؤں۔“

میں جاتے جاتے رکی فیضان مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ارے نہیں چدا، اس وقت بالکل ٹھیک ہوں۔“

انہوں نے اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں کہا اور میں باہر نکل آئی۔ آج یوں بھی میں بے حد تھک گئی تھی سر نیازی ہمیں فونٹین ہاؤس لے گئے تھے اور یہ ہمارا سوال وزٹ تھا۔ فونٹین ہاؤس کالج اور یونیورسٹی کے دوران بھی دو تین بار جا چکے تھے دوبار تو یونیورسٹی نے ڈاکٹر فرقان سے کہہ کر پروگرام بنایا تھا، جب ہم انٹرن شب کر رہے تھے تب اور اب، آج کا پروگرام بھی دراصل حسان کا ہی ترتیب دیا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا ہم ہفتے میں کم از کم دوبار وہاں جا کر رضا کا رانہ طور پر کچھ کریں۔ مریضوں کو کچھ سکھائیں یا کوئی بھی مثبت کام۔ ہم نے دیکھا تھا کہ کچھ لڑکیاں شاید فائن آرٹس کی سٹوڈنٹس تھیں، رضا کا رانہ طور پر آکر وہاں موجود لڑکیوں کو پیمنٹنگ اور فلاور میکنگ سکھاتی تھیں۔

”تم کیا سکھاؤ گے تمہیں آتا ہی کیا ہے سوائے باتیں بنانے کے!“ یہ فرما رہا تھا۔

”تو چلو باتیں ہی کر لیں گے۔ باتوں سے بھی کتنا رس ہوتا ہے نا۔“

حسان کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔ سو ہم آج دسویں بار فونٹین ہاؤس گئے تھے ان دو سالوں میں کئی پیشرفت چلے گئے تھے اور کئی ابھی تک وہاں ہی تھے۔ وہاں ہم نے ایک مشہور اداکار کو بھی دیکھا جو پچھلے سال بھی وہاں ہی تھے، ایک مشہور کھلاڑی بھی جو ابھی نئے آئے تھے۔

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زمانے نے اس حال کو پہنچایا۔“ حسان نے تبصرہ کیا تھا۔

وہاں بہت سارا وقت گزار کر جب میں گھر آئی تو بے حد تھک چکی تھی لیکن جیناں سے پتا چلا کہ صبح بیا کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا اور اب بھی انہیں سر درد ہے اور وہ اپنے کمرے میں ہیں سو میں بیا کے پاس چلی آئی تھی۔ رومی اور ریان فیضان کے ساتھ گئے ہوئے تھے اور ممبا پنا کسی

شاید حسان صحیح کہہ رہا تھا وہاں رہنے والے خوش نہ تھے اور یہاں والے انہیں رشک سے دیکھتے تھے۔

فیضان اور ماموں کی رہائش تو اپنے ہی پورشن میں تھی۔ ہاں کھانا ہم سب اکٹھے کھاتے تھے۔ اس روز بیا کی طبیعت خراب تھی میں سردی ہی تھی کہ فیضان اندر داخل ہوا مجھے دیکھ کر یکدم ہی اس کی آنکھیں لودینے لگی تھیں۔ پتا نہیں واقعی ایسا تھا یا صرف میں نے محسوس کیا تھا لیکن میں نے اکثر محسوس کیا تھا کبھی کبھی وہ مجھے بڑی وارفتگی سے دیکھتا تھا گو میں نے اس کے ذومعنی جلوں کو معنی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”یہ تم کہاں غائب رہتی ہو سو؟“

وہ بڑی بے تکلفی سے کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیانے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”اسلام علیکم بیا کیا طبیعت خراب ہے؟“

”نہیں بیٹا بس یوں ہی ہلکا سا سرد رہتا۔“

”ارے بیا لٹی رہیں میں دبار ہی ہوں نا آپ کا سر۔“

”نہیں بیٹا اب کافی آرام ہے۔“

بیانے ایک محبت بھری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر فیضان کی طرف دیکھا۔

”آج صبح سے کہاں غائب تھے بیٹا؟“

”میں ریان اور رومی کے ساتھ ہرن مینار دیکھنے گیا تھا۔“

”تم کیوں نہیں گئیں؟“ بیانے مجھے دیکھا۔

”ریان اور رومی فرسٹ ایئر کے امتحان دے کر فارغ ہو چکے ہیں جبکہ ابھی مجھے

کچھ دن مزید جانا ہے۔“

میں نے بیا کو بتایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیا میں جیناں کے ہاتھ دودھ بھجواتی ہوں ضرور لیجے گا۔“

میں نے آنکھوں میں حیرت بھر کر اسے دیکھا۔
 ”ہاں تمہارے لیے سوئی۔“
 اس کی آواز تھوڑی بوجھل ہو گئی۔

”تم جانتی ہو میں یہاں صرف ڈیڈ کے کہنے پر آیا تھا۔ میرا مقصد صرف اپنا وطن دیکھنا تھا جسے تین سال کی عمر میں نے چھوڑا تھا بلکہ میں ڈیڈ کے اس خیال سے بھی متفق نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں بزنس کے امکانات کا جائزہ لیں لیکن سوئی جب میں نے جہیں دیکھا تو میں یہ نہیں کہتا کہ پہلے روز پہلی ہی نظر میں تمہارے لیے دل میں کچھ محسوس کیا تھا لیکن چند دن بعد ہی مجھے لگنے لگا تم بہت خاص ہو۔ جیسے تمہیں میرے لیے ہی تخلیق کیا گیا ہو، سوئی میرے دل میں تمہارے لیے بہت انوکھے سے جذبے پیدا ہونے لگے ہیں۔ سچ کہتا ہوں سوئی پاکستان آتے ہوئے میرے دل میں تصور نہ تھا کہ مجھے کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا ہے بلکہ میں دل ہی دل میں ایک لڑکی کو پسند بھی کر چکا تھا وہ لڑکی بھی میرے بچپن سے ہی امریکہ میں سٹبل ہے۔ جب بھی ممانے شادی کی بات کی میرے ذہن میں اسی کا ہی خیال آیا تھا کہ وہ ایک پرفیکٹ لڑکی ہے اور میں نے سوچا تھا کہ میں پاکستان سے واپسی پر ماما کو بتا دوں گا وہ لڑکی میری کلاس فیلو تھی گو میں نے کبھی اس کے ساتھ اپنے فیلنگو شیئر نہیں کئے تھے لیکن وہ مجھے وہاں موجود لڑکیوں سے مختلف ضرور لگتی تھی لیکن سوئی محبت کیسے کسی کے دل میں امیر کرتی ہے اور کیسے کوئی دل کے اندر چھپ کر بیٹھ جاتا ہے یہ تمہیں دیکھ کر جانا۔“ وہ بول رہا تھا اور میں ستون سے فیک لگائے حیرت سے سن رہی تھی۔

”سوئی!“

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

”I Love You“

اور میرا دل یکدم سینے کے اندر یوں زور سے دھڑکا جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا میری تھیلیاں سینے سے بھگ گئیں۔

بارنی میں جانے کے لیے کچھ دیر پہلے لٹکے تھے اس لئے میں کوئی دو تین گھنٹے سے بیا کے پاس ہی تھی۔ فیضان کے ساتھ یقیناً رومی اور ریان بھی آچکے ہوں گے دونوں کو ہیلو ہیلو کر کے میں اب آرام کروں گی بلکہ جیناں سے کہہ دوں گی کہ مجھے رات کے کھانے کے لیے نہ بلائے۔ صبح آج جلدی اٹھ گئی تھی اس لیے آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں میں سو جتی ہوئی اپنے پورشن کی طرف جارہی تھی کہ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر دیکھا تو فیضان تھا۔

”تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟“

”میں نے رومی کو بتایا تو تھا صبح میرا ایک اہم لیکچر ہے اور پھر ہمیں سر نیازی کے ساتھ فونٹین ہاؤس بھی جانا ہے۔“ میں وہاں ہی ستون کے پاس رک گئی۔

”اور کل تمہیں مینٹل ہاسپٹل جانا ہے اور پرسوں تمہیں کہیں اور جانا ہوگا۔“ وہ جیسے چڑ کر بولا تھا مجھے ہنسی آ گئی۔

”تم ہنس رہی ہو اور مجھے غصہ آرہا ہے۔“ وہ جیسے اور چڑا تھا۔

”اس میں غصے کی کیا بات فیضان، ظاہر ہے مجھے کل بھی اور پرسوں بھی جانا ہے۔“

”تم چند دن کے لیے چھٹی نہیں کر سکتیں۔“ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مگر فیضان ابھی دس پندرہ دن رہ گئے ہیں ہمارا کورس ختم ہونے میں۔“

”اف او!“

اس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر بائیں ہاتھ پر مارا۔

”تم جانتی ہو میں یہاں کیوں رکا ہوں؟“

”شاید بزنس کے لیے کوئی۔۔۔“

”احق لڑکی میں تمہارے لیے رکا ہوں صرف تمہارے لیے۔“

”میرے لیے!“

”سوی تم۔۔۔۔۔ تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے؟“

وہ بے حد اشتیاق سے مجھے دیکھ رہا تھا میری نظریں جھک گئیں ظاہر میرا خیال اس کے متعلق کیسے برا ہو سکتا تھا۔ مجھے وہ اچھا ہی لگتا تھا لیکن میں نے اس طرح اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا جس طرح وہ سوچ رہا تھا۔

”تم بہت خوبصورت ہو سوی بے حد، لیکن اپنی خوبصورتی اور حسن سے بے نیاز، لا پرواہ اور یہ بے نیازی تمہیں اور حسین بنادیتی ہے۔“

دھک دھک مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

”اور تمہارا من بھی بہت خوبصورت ہے ریان کہتا ہے سوی کا نام اگر سوی کے بجائے محبت ہو تو بالکل صحیح ہے، وہ کہتا ہے تم سراپا محبت ہو۔ کیا چند جڑے ہمیں بھی عنایت ہو سکتے ہیں؟“

اس کے لہجے میں شوخی در آئی تھی۔ میں جو فراز اور حسان سے لمبی لمبی بحث کرتی تھی دلائل دیتی تھی اور فراز کا مذاق اڑاتی تھی کہ وہ محبت کا راگ الاپتا رہتا ہے۔ اب نگاہیں جھکائے چپ کھڑی تھی اور فیضان کی نظروں کی تپش سے میرے رخسار جیسے دھک رہے تھے۔

”سوی!“

وہ یکدم سنجیدہ ہوا۔

”اگر میں تمہارے متعلق مماسے کہوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

بالکل غیر ارادی طور پر میرا سر نفی میں اٹ گیا اور بھلا اعتراض والی بات بھی کیا تھی خوبصورت، ایجوکیٹڈ، ویل سیلیڈ۔

”تھینکس سوی! میں دو تین روز تک مماسے بات کروں گا۔“

لیکن میں اس کے بعد وہاں نہیں رہی تھی اور اپنے پورشن میں قدم رکھنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تھا وہ اس ستون سے فیک لگائے کھڑا پر شوق نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا

میرے مڑ کر دیکھنے پر وہ مسکرایا تیزی سے رخ موڑ لیا اور اس کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔

”کپٹنگ نے کہا تھا مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔“

اور میں جلدی سے روی کے کمرے میں گھس گئی تھی۔

وہ اپنے بینڈ پر جوتوں سمیت لیٹی ہوئی تھی۔

”بہت تھک گئی ہوگڑ یا؟“

میں نے اس کی پیشانی چومی تھی میں پورے دس بلکہ گیارہ گھنٹوں بعد اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہوں!“ اس نے بند آنکھیں کھولیں اور میری گردن میں بازو ڈال کر جواباً

میرے رخسار کو چوم لیا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ دونوں ہی دمک رہے تھے اور وہ بے حد

خوبصورت لگ رہی تھی نظر لگ جانے کی حد تک۔

”اچھی سوی بہت مزا آیا فیضان بھائی کے ساتھ لیکن تم نہیں تھیں تا تو ایک کی سی لگتی

رہی۔“

”میری جان چند دن کی بات ہے پھر ہم سب اکٹھے جائیں گے کسی روز

گھومنے۔“ میں نے جھک کر اس کے جوتوں کے اسٹریپ کھولے۔

”ایزی ہو کے لیٹ جاؤ میں جیناں کے ہاتھ کھانا کمرے میں ہی بھجوا دوں گی۔“

”تمہیں فیضان بھائی نے اتنا کھلایا پلایا ہے کہ کچھ کھانے کی گنجائش ہی نہیں۔“

”او کے پھر آرام کرو گڈ نائٹ۔“

اسے خدا حافظ کہہ کر میں ریان کے کمرے میں گئی تو وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا۔

”ارے تم تھکے نہیں ہو!“

”اوہ نہیں بلکہ بہت! انجوائے کیا فیضان بھائی بہت سویٹ اور ٹائکس آدمی ہیں۔“

روی اور ریان دونوں ہی فیضان کی تعریف کر رہے تھے تو۔۔۔ میں جب اپنے

نیز پر لٹی تو مجھے فیضان کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں آنکھیں موندے کتنی دیر تک ایک نئے احساس میں گھری رہی، یہ جذبہ، یہ احساس یہ سب بہت نیا نیا سا لیکن بہت دلکش سا تھا کہ کوئی مجھے چاہتا ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے اپنا رفیق زندگی کرنا چاہتا ہے۔ میں کچھ دیر پہلے نیند سے بڑھال ہو رہی تھی اب مسلسل فیضان کو سوچے جا رہی تھی اور اس نئے نئے احساس میں گھری صبح تک جاگتی رہی اور اگلے کئی دن تک یہ احساس اندر رنگ سا بکھیرتا رہا۔ آتے جاتے فیضان کی با معنی بات کوئی خوبصورت جملہ اور کہیں اکیلے میں چند لمحوں کی ملاقات میں جذبول کا خوبصورت اظہار اور یہ ایک دو جملے سارا دن مجھے خوش رکھتے تھے۔ ان دنوں ماما کا رویہ بھی مجھے نارمل سا لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارے شہر محبت میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوں، خوشیاں ہی خوشیاں ہوں مجھے لگتا تھا جیسے میں خوشیوں کے جمولے میں بیٹھی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہوں، اونچا اور اونچا۔ میرا دل چاہتا تھا بہت پہلے کی طرح میں اور رومی ہاتھوں میں ہاتھ دیے پورے گھر میں چکراتے پھریں اونچا اونچا گاتے ہوئے۔

یہ شہر محبت ہے

اس شہر کے لوگوں میں

یہاں وہاں، لان میں، کورنڈور میں لاؤنج، میں کمروں میں ہر جگہ۔

”کیا بات ہے سوئی ان دنوں بہت خوش نظر آ رہی ہو کیا کہیں سے خزانہ مل

گیا ہے۔“

حسان نے بھی شاید میرے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو بھانپ لیا تھا اور کیا حسان

اتنے دھیان سے مجھے دیکھتا ہے اور کیا اس محبت اور خوشی کا عکس میرے چہرے سے بھی جھلکتا

ہے میں نے سوچتے ہوئے حسان کو دیکھا تھا وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

”بہت خوش ہو۔۔۔۔۔ ہیں نا۔“

”ہاں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”پتا نہیں شاید اس لیے کہ مجھ سے گھر پر ہیں اور شاید اس لیے کہ

فیضان آیا ہوا ہے اور اس کے آنے سے سب خوش ہیں۔“

”فیضان کیسا ہے؟“

پتا نہیں کیوں حسان نے پوچھا میں نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

”بہت اچھا ہے۔“

ایک لمحہ کو مجھے لگا تھا اسکے چہرے پر سایہ سا آگیا لیکن وہ دوسرے ہی لمحے پوچھ رہا

تھا۔

”یہ نائید کہاں غائب ہو گئی ہے دو دن سے غیر حاضر ہے۔“

”گو جرنوالہ سے اس کی امی، میرا مطلب اس کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔“ میں نے

بتایا۔

”دیے یہ فیضان صاحب کسی نیک ارادے سے تو نہیں آئے؟“

وہ پھر فیضان کے متعلق پوچھنے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”یعنی شادی خاندان آبادی۔“ وہ جیسے زبردستی ہنسا تھا، میں نے نظریں چرا لیں۔

”تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی سوئی۔“ یکدم وہ تیز آواز میں بولا۔

”تمہارا یہ کزن ضرور تمہیں دیکھنے اور پسند کرنے آیا ہوگا۔“

میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی لیکن وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہال کی طرف چلا گیا اور مجھے

اس کے انداز سے کی درنگی پر حیرت ہوئی اور میں دل میں تھوڑی سی شرمندہ ہوئی کہ یوں تو

میں ان سب کو دوست سمجھتی ہوں خصوصاً حسان اور نائید کو اور میں نے فیضان کے متعلق ان

سے چھپالیا ہے کم از کم اب حسان کے پوچھنے پر مجھے اسے بتا دینا چاہئے تھا کہ فیضان نے

رہیں۔ وراصل میری منگنی میرے چچا زاد سے ہو رہی ہے جو شادی کے بعد مجھے اپنے ساتھ سعودیہ لے جائے گا۔“

”اور ایک دن سوی بی بی بھی شادی کر کے کسی دور دیس چلی جائیں گی۔“
حسان جانے کب وہاں آ گیا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں اور شاید اس نے دو دن سے شیو بھی نہیں کی تھی۔

”یہ تم لڑکیاں آخر یہاں کر دو رہیں کیوں چلی جاتی ہو خوش ہو کر۔“
”ہم کب خوش ہوتی ہیں دور دیس میں جا کر۔“ نائید کی پلکیں نم ہو گئیں۔
میں نے حسان کی طرف دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح بے تکی سی بات کر کے اب فراز کے متعلق بتا رہا تھا کہ کیسے اس کا سکول پھسل گیا اور وہ۔۔

”حسان تم نے اپنا گھر پھر چھوڑ دیا، بھلا کوئی یوں بھی ناراض ہو کر گھر چھوڑتا ہے۔ تم ہی ان کی بات مان لیتے، مینٹل ہاسپٹل بنوانا کوئی ضروری تو نہیں۔“
”مان تولی تھی ان کی بات لیکن کیا اپنے سارے خوابوں سے دستبردار ہو جاؤں۔“
ایک بات میں نے ان کی مانی ہے ایک وہ مان لیتے۔“

”تمہارا پہلا خواب تھا مینٹل ہاسپٹل بنوانا اور دوسرا خواب کیا تھا اس سے پہلے تو تم نے نہیں بتایا۔“

نائید نے پوچھا تو بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکل گیا۔

”کہیں کسی سے محبت تو نہیں کر بیٹھے حسان۔“

اس نے بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”محبت کو پہچانتی ہو سمعیہ احمد۔“

میں نے ہاں ہاں کہتے لب بھیج لیے تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر یکدم مڑا اور جھڑ سے آیا تھا ادھر ہی تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔

”یہ حسان کچھ عجیب سا نہیں ہو گیا۔“ میں نے نائید کی طرف دیکھا۔

مجھے پر پوز کیا ہے اور بہت ہی جلد اس کی مہمیا، مہمیا کو فون کرنے والے ہیں۔ خیر میں نے کندھے اچکائے پھر کسی روز بتا دوں گی ابھی تو ہیں نا ہم یہاں۔

ان دنوں فیضان کے خوبصورت جملے، اس کی وارفتگی سے سختی نظریں ہر وقت مجھے یوں اندر گرم رکھتے تھے کہ مجھے احساس تک نہ ہوا کہ حسان پریشان ہے لیکن اس روز کنٹینن کی طرف جاتے ہوئے نائید نے مجھے بتایا۔

”جسمیں پتا ہے حسان آج کل پھر مہمیا سے ناراض ہو کر کسی ہوٹل میں رہ رہا ہے۔“

”نہیں تو!“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”جسمیں کس نے بتایا؟“
”حسان نے۔ میں نے پوچھا تھا وہ اتنا اپ سیٹ کیوں لگ رہا ہے تو اس نے بتایا۔“

”کمال ہے مجھے احساس تک نہیں ہوا۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔
”ان دنوں تم پتا نہیں کہاں کھوئی ہوتی ہو، تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ فراز کل سے کیوں نہیں آ رہا۔“

”اوہ ہاں خیریت ہے نا۔“ میں چونکی۔
”حسان بتا رہا تھا کہ موٹر سائیکل پھسل جانے سے معمولی سا فیکر ہو گیا ہے اس کے بازو میں۔“

”اوہ۔ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟“
”نہیں کل حسان گیا تھا اس کی طرف، کل آئے گا۔“
”کل تو ہمارا آخری دن ہے ناں پھر۔۔“
”ہاں پھر شاید کبھی ملاقات نہ ہو۔“ نائید بھی افسردہ ہو گئی۔

”میں تو گوجرانوالہ جا رہی ہوں میرے ابا، حقیقی والے بہت بیمار ہیں نا۔ ہم سب ہی جا رہے ہیں امی اور ابو بھی اب وہاں ہی رہیں گے، اماں ابا کی خواہش ہے کہ ہم وہاں

”تمہیں آج محسوس ہوا ہے میں تو جب سے چھٹیاں گزار کر آئی ہوں ایسے ہی لگ رہا ہے، خفا خفا اور ناراض سا حالانکہ گھر تو اس نے اب چھوڑا ہے کوئی چھ سات دن پہلے۔“

اور اس روز ہمیں حسان پھر نظر نہیں آیا شاید وہ ہوسٹل چلا گیا تھا حالانکہ سر بخاری نے بھی اس کا پوچھا تھا۔ اگلے روز بھی وہ لیٹ آیا تھا یہ ہمارا آخری دن تھا، یہاں اس انشٹیٹیوٹ میں۔ فراز بھی پلانٹر چڑھے بازو کے ساتھ آیا تھا۔ نائید نے ہم سب سے ہمارے نمبرز لئے تھے فراز اور حسان نے بھی اپنے سیل نمبرز ہمیں دیے۔

”کبھی یاد کر لیا کرتا۔“ فراز نے نائید کو نمبرز دیتے ہوئے کہا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتی فراز، مجھے اپنے ہونے والے میاں کے مزاج کا کچھ اندازہ نہیں اگر شکی مزاج ہوا تو۔۔۔ لیکن میں تمہیں اور حسان کو ہمیشہ اپنی اچھی یادوں میں محفوظ رکھوں گی۔“

اس کی آنکھیں تو فوراً برسنے لگی تھیں۔

”تم بھی تو کچھ کہو نا کیا تم بھی۔۔۔“

فراز نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں فیضان تو بہت براڈ مائنڈڈ ہے۔“ میں نے سوچا اور مسکرا دی۔

”میں فون کروں گی تم دونوں کو، لیکن اگر بیویاں خونخوار ہوئی اور انہوں نے کہا اے لڑکی تم کون ہوتی ہو میرے میاں کو فون کرنے والی۔۔۔“

”ہاں یہ سوچنے والی بات ہے بس تم ہمارے حق میں دعائے خیر کرتی رہنا کہ ہمیں اچھی بیویاں ملیں، تمہارے جیسی۔“

فراز کے ہونٹوں پر شریسی مسکراہٹ تھی۔

”تو تم دونوں نے ہی کیوں نہ سوچا ہمیں۔“

نائید نے روتے روتے سراٹھا کر بتا سوچے کچھ کہا اور پھر زبان دانتوں تلے دبا

لی میں بے اختیار فیس دی۔ حسان اس تمام وقت میں خاموش بیٹھا گھاس توڑتا رہا۔

”حسان اپنے پیامما سے صلح کر لو۔“

جاتے جاتے میں نے اسے نصیحت کی۔

”یوں اس طرح ناراض ہو کر گھر نہیں چھوڑتے حسان، اپنا گھر اپنے لوگ انسان

ان سے ہی تو معتبر ہوتا ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا تھا اور میں گھر آگئی۔ زندگی کا ایک اور چمپر کلوز ہو گیا تھا بہت سارے خوشگوار دنوں پر مبنی یہ سال میری یادوں کی کتاب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس روز میں اندر سے بہت اداس رہی تھی حالانکہ فیضان نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی ممما سے اور پیپا سے میرے متعلق بات کر لی ہے۔ ممما تمہیں دیکھنے کو بے تاب ہیں سوئی اپنے اکلوتے بیٹے کی پسند کو اور شاید آج رات ہی وہ پھوپھو سے بات کریں گی لیکن ممما بڑے دنوں بعد آج صبح ہی اسلام آباد آگئی تھیں، صرف چند دنوں کے لیے اور ان چند دنوں میں فیضان کی رفاقت نے میری اداسی بہت حد تک دور کر دی تھی اور اب میں صرف فیضان کے متعلق سوچ رہی تھی۔

میں سمیعہ احمد شاید دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی میرے پاس سب کچھ تھا ممما پیپا، ان کی شفقتیں حیران اور رومی کی محبتیں، یہ خوبصورت گھر میرا شہر محبت اور پھر سب سے بڑھ کر فیضان کی محبت، اس کی چاہت اس کی وارنٹی۔ ہاں میں واقعی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ بھلا اس کے علاوہ کسی لڑکی کو اور کیا چاہ ہو سکتی ہے۔

میرا دل چاہا میں دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اپنی اڑی پر گھوم جاؤں اور پھر گھومتی جاؤں اور مست کر دینے والی خوشبوئیں میرے اندر اترتی جائیں۔ جنیلی اور سوچی کی خوشبوئیں جو میرے گھر کی ہواؤں میں بکھری تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی فیضان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ممما نے پھوپھو سے بات کر لی ہے اور وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”اب فاصلے مٹنے والے ہیں۔“

اس کے ساتھ شاپنگ کر کے جب میں گھر آئی تو اندھیرا تھا اور اگر بیا دیکھ لیتیں تو باریش ہوتیں۔ گو ہم ڈرائیور کے ساتھ ہی جاتے تھے لیکن بیا کہتی تھیں مغرب سے پہلے گھر آجایا کرو مجھے نہیں پسند لڑکیوں کا آدھی رات تک مارکیٹوں کے چکر لگانا۔

بیا اپنے پورشن میں تھیں ہم دونوں جلدی جلدی اپنے اپنے کمروں میں تھیں گئیں۔ پورچ میں بیا کی گاڑی نہیں تھی گو یا وہ ابھی تک آفس سے نہیں آئے تھے میں نے کہا میں ایک طرف رہیں اور فریش ہو کر جیناں کو چائے بنانے کا کہا۔ میں پہلے تو چائے کی مادی نہ تھی بیا چائے پینے ہی نہیں دیتی تھیں۔ انٹرن شپ کے چھ مہینوں کے دوران اچھی خاصی عادی ہو گئی تھی اس وقت ہلکا سرد بھی شاید اس لیے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے شام میں چائے نہیں پی تھی۔ رومی تو جب بھی شاپنگ کے لئے جاتی تھی تھک جاتی تھی اور آج تو ہم نے چکر بھی بہت لگائے ایک شاپ سے دوسری شاپ تک، رومی کو کوئی گفت پسند ہی نہیں آتا تھا۔

وہ اب بیڈ پر پڑی ہوگی، تھکی باری۔ میں نے سوچا اور چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی میں ہاتھ میں ایک کتاب پکڑے بیا کی طرف جاری تھی لیکن واقعی میں بیا کی طرف جاری تھی یاد دل میں کہیں فیضان کو دیکھنے کی چاہ بھی تھی۔ ہمارے شاپنگ پر جانے سے پہلے وہ اور بیان کہیں چلے گئے تھے ماما کی گاڑی میں۔ یہ نئی گاڑی ممانے کچھ ہی دن پہلے لی تھی اور وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے سوچا تھا فیضان کے آنے تک بیا کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھوں گی اور فیضان کی عادت تھی وہ باہر سے آتا تو پہلے بیا کو ضرور سلام کرنے ان کے کمرے میں جاتا تھا اور پھر اپنے کمرے میں جاتا تھا۔ بیا کے کمرے کے بالکل ساتھ بائیں طرف اس کا بیڈروم تھا۔

میں اپنے ہی دھیان میں مگن بیا کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور ابھی محل نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رک گئی، اندر سے ماما کی آواز آ رہی تھی۔
”بیا میں بہت اپ سیٹ ہوں۔“

وہ شوخ شوخ گہری گہری نظروں سے مجھے نکلتا ہوا بیان کے کمرے کی طرف چلا گیا تھا اور میں اس روز کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ایک بار رومی میرے کمرے میں آئی تھی میں نے یونہی ایک کتاب اٹھالی تھی۔

”ان دنوں تم بہت بور ہو گئی ہو سو۔“

اس نے گلہ کیا تھا۔

”ہا نہیں کن خیالوں میں گم رہتی ہو۔“

”ناراض ہو۔“

میں نے کتاب رکھ کر اسے گدگدایا تو وہ ہنسنے لگی۔

”پلیز نہیں۔۔۔ سوئی ایسے مت کرو۔“

”تو ناراض نہیں ہوتا۔“

”لیکن تم نے کیا کہا تھا کہ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلو گی مجھے میڈم آسیہ کے لیے ایک گفت لینا ہے ان کی برتھ ڈے پر بھجواؤں گی۔“

میڈم آسیہ میری بھی پسندیدہ منیجر تھیں۔

”چلو ابھی چلتے ہیں۔“ میں رومی کو ناراض نہیں کر سکتی تھی کبھی بھی نہیں۔

”اور پتا ہے دو دن بعد فیضان بھائی کی بھی برتھ ڈے ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مجھے ان کے لیے بھی گفت لینا ہے۔“

”اچھا لے لینا لیکن تمہیں کس نے بتایا؟“

مجھے اس کی معلومات پر حیرت ہوئی۔

”میں نے خود پوچھی تھی ان کی ڈیٹ آف برتھ لیکن آپ ان کو نہ بتانا میرے

گفت کا، میں سر پرانہ دو گی انہیں۔“

”اور میں، مجھے بھی تو کچھ لینا چاہیے نا۔“ میں نے سوچا اور کچھ کتابیں خریدی

تھیں۔ سن کل فارغ ہوں پڑھوں گی۔ میں نے رومی کو بتایا تھا۔

”جیسا میں اپنے بچنے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“
میرادل جیسے نیچے پاتال میں گر گیا میری ساعتوں میں ایک لفظ زندہ رہ گیا ”اپنی

بیٹی“

”تو کیا سوئی تمہاری بیٹی نہیں وہ بھی تو۔“

”نہیں ہے وہ میری بیٹی بیا آپ جانتی ہیں نہیں ہے وہ میری بیٹی۔ آپ فون کریں بھائی کو سمجھائیں۔“

وہ ہتا نہیں اور کیا کیا کہہ رہی تھیں لیکن میرے ارد گرد جیسے زندگی مرگئی تھی میری ساتیں ختم ہو گئی تھیں میں کچھ نہیں سن رہی تھی۔ میرے ارد گرد جیسے سب کچھ ساکت تھا پھر مجھے لگا جیسے میں کسی بڑی اونچی بلڈنگ کی بیس سنٹ میں بند ہو گئی ہوں اور پوری عمارت دھڑ دھڑ میرے اوپر گر رہی ہے۔ میں بھاری طے تلے دب گئی ہوں میرا سانس بند ہو رہا ہے اور میری جینیں میرے اندر ہی گھٹ گئی ہیں۔ ہتا نہیں کتنی دیر میں اس کیفیت میں کھڑی رہی پھر ہولے ہولے میرے گرد آوازیں زندہ ہونے لگیں اندر سے کھیلوں کی بھنکناہٹ کی سی آواز آئی میرے کانوں نے کسی بھی لفظ کو وصول نہیں کیا تھا۔

تو کیا میرا ”شہر محبت“ اجڑ گیا۔

کیا اس کی دیواریں اور چھتیں میرے اوپر آپڑی ہیں۔ میں نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھا سب ویسا ہی تھا۔ سامنے لان میں درختوں کے پتے تیز ہوا سے مل رہے تھے فضا میں موچے، رات کی رانی اور گلاب کی مہک تھی۔ ٹی وی لاؤنج کے باہر چلنے والی لائٹ اسی طرح جل رہی تھی۔

”نہیں!“

میرے لبوں سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

”نہیں!“

اور پھر میں تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ یہ گھر میرا نہیں تھا یہ

”اس میں آپ سیٹ ہونے کی کیا بات ہے جیا، بیٹیوں کو ایک دن رخصت کر ہی ہوتا ہے۔“

”آپ میری بات نہیں سمجھ رہی ہیں۔“ ماما کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”بھابھی نے سوئی کے لیے کہا ہے، فیضان کا رشتہ سوئی کے لیے مانگا ہے۔“

”ہاں ہاں بتایا تو ہے تم نے، فیضان اچھا لڑکا ہے تمہیں اعتراض ہے کیا؟“

بیا بہت پرسکون سی تھی اور میرادل مانو میرے سینے سے نکل کر جسم کے ہر حصے میں

دھڑکنے لگا تھا۔

”میں نے کب کہا ہے کہ فیضان میں کوئی برائی ہے۔ میرے بھائی کا اکلوتا بیٹا

ہے مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز اور پیارا ہے لیکن بیا میری خواہش تھی کہ فیضان کا رشتہ روئی سے ملے پاتا اور میں نے اس لیے بھائی جان سے کہا تھا کہ وہ فیضان کو ضرور ساتھ لائیں اور میں نے اپنی خواہش بھی بتادی تھی انہیں۔“

میرادل جیسے میرے وجود کے اندر ساکت ہو گیا یہ ماما کیا کہہ رہی ہیں۔ آخر وہ

ایسا کیوں چاہتی ہیں اور روئی تو ابھی بہت چھوٹی ہے اور فیضان تو مجھ سے بھی چار سال بڑا ہے۔

اور یہی بات بیانے کہہ دی۔

”کیا کہہ رہی ہو جیا روئی تو ابھی بہت چھوٹی ہے، اور پھر فیضان نو سال بڑا ہے

اس سے۔“

”تو کیا ہوا۔“ فصیح بھی تو مجھ سے دس سال بڑے ہیں اور روئی بھی کوئی چھوٹی

نہیں ہے اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے۔ دو سال تک گریجویشن کر لے گی تو شادی کر دیں

گے۔“

”لیکن آخر جیا سوئی اور فیضان کے رشتے میں کیا برائی ہے؟“ بیا کی آواز پست

تھی میرا تو سارا وجود کان بنا ہوا تھا۔

”میں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔“

یہ رات کتنی طویل تھی اس رات کی صبح کب ہوئی تھی مجھے نہیں پتا، میں نے تو یوں ہی بیٹھے بیٹھے رات گزار دی تھی۔ جب میری کھڑکی کے باہر سے چڑیوں کی چوں چوں اور دوسرے پرندوں کی چہکار سنا کی دی تھی تو میں اسی طرح بیٹھی تھی یوں ہی گھنٹوں پر سر رکھے اور بازو لپیٹے۔

کل تک میں ان آوازوں کو اپنے بیڈ پر لیٹے بہت خوشی اور مسرت سے سنتی تھی جو مجھے صبح ہونے کا پیغام دیتی تھیں لیکن آج ان آوازوں نے بھی میرے ساکت وجود میں جنبش نہیں کی تھی پھر کچھ دیر بعد مجھے باہر آہٹیں سنائی دینے لگیں، یہ آہٹیں جینا اور قاس کی تھیں جینا صبح صبح سب ملازموں کو ناشتہ دے دیتی تھی۔ چونکدار، ڈرائیور، مالی اور وہ خود ناشتہ کرنے کے بعد بیا، ماما، پاپا کے لیے بیڈٹی دم کر کے ان کے بیڈروم میں لے جاتی تھی لیکن جب سے فیضان آیا تھا وہ فیضان کے لیے بھی بیڈٹی اس کے روم میں ہی لے کر جاتی تھی اور فیضان کا خیال آتے ہی میں چونکی۔

فیضان۔۔۔۔۔ پوری رات میں نے فیضان کے متعلق ایک بار نہیں سوچا۔ میری نئی نوپلی محبت اجڑ گئی تھی ابھی تو اس محبت نے میرے دل کے گلشن میں آنکھ کھولی ہی تھی ابھی تو میں اس کی خوشبو کو صحیح طرح سے محسوس بھی نہیں کر سکی تھی کہ۔۔۔ اور میری سماعتوں میں جیسے کچھ اور لفظ زندہ ہو گئے ہاں جب میں بیا کے کمرے کے باہر کھڑی تھی اور اس گھر کی دیواریں مجھ پر گر رہی تھیں تب ہاں تب ممانے کہا تھا۔

”بیاروی بھی فیضان کو بہت پسند کرتی ہے میں نے پوچھا تھا اس سے۔“

ہاں شاید ممانے ایسا ہی کچھ کہا تھا میں نے گھنٹوں سے سراٹھا کر خالی خالی نظروں سے دوسرے بیڈ کی طرف دیکھا جہاں اکثر روی سو جاتی تھی لیکن آج روی نہیں تھی ہاں آج میں نے خود ہی تو دروازہ نہیں کھولا تھا۔

اور کیا ہوا جو روی فیضان کو پسند کرتی ہے۔ روی کو تو ہر وہ کام پسند ہے جو مجھے پسند

کمرہ میرا نہیں تھا یہ سب لوگ میرے نہیں تھے جن سے آج تک میں بے تحاشہ محبتیں کرتی آئی تھی اور جنہیں ہمیشہ میں نے اپنا سمجھا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے یکدم ہی اس گھر کی ساری دیواریں ساری چھتیں مجھ پر آ پڑی ہوں اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے۔ میری سماعتوں میں صرف وہی الفاظ تھے جو ماما کے لبوں سے نکلے تھے۔

”سوی میری بیٹی نہیں ہے بیا آپ جانتی ہیں۔“

بیا جانتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی میرے شک کی تائید نہیں کی تھی کبھی مجھے نہیں

بتایا تھا کہ میں۔۔۔

میں اپنے بیڈ پر گھنٹوں کے گرد دونوں بازو لپیٹے بیٹھی تھی میں نے اپنے کمرے کی لائٹ نہیں جلائی تھی دروازہ لاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرتا چاہتی تھی مجھے پتا تھا مجھے کوئی نہ کوئی ڈنر کے لیے بلانے آئے گا اور رات کے کسی پہر ہمیشہ کی طرح روی اٹھ کر میرے کمرے میں آجائے گی، اگر چہ اب وہ کبھی سمجھا رہا ہے کہ میں ہی سو جاتی تھی لیکن وہ زیادہ تر میرے کمرے میں آ جاتی تھی اور میں۔۔۔ نہیں جانتی تھی مجھ پر کیا گزر رہی ہے جو بھی گزر رہا تھا وہ میان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا شاید میں ٹوٹ رہی تھی بکھر رہی تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں ان میں ریت بھری تھی اور میرے اندر جیسے سب کچھ ڈھے گیا تھا۔ باہر آوازیں زندہ ہو گئی تھیں شاید جیناں نے دروازہ بھی کھٹکھٹایا ڈرائنگ روم سے برتنوں کی آوازیں بھی آئیں تھیں اور میرے دروازے کے باہر بیا نے شاید کسی سے کہا تھا سو گئی ہوگی آج تھک بھی تو بہت گئی تھی۔

اور پھر شاید رات کو کسی وقت روی نے دستک دیتے ہوئے مجھے پکارا تھا لیکن میں پھرتی ہوئی تھی یونہی گھنٹوں پر سر رکھے بازو گھنٹوں کے گرد لپیٹے بیٹھی رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا جیسے ریکارڈ کی سوئی بار بار ایک جیسے پرائک جائے میرے اندر بھی بس تکرار جاری تھی۔

”وہ میری بیٹی نہیں۔“

ہے، اسے ہر وہ بندہ اچھا لگتا ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے، ہر ڈش اس کی پسندیدہ ہے جو مجھے پسند ہے۔ میں نے خالی خالی ذہن کے ساتھ سوچا تھا اور بس فیضان کا خیال چند لمحوں کے لئے میرے دل میں آیا تھا۔ میں نے دوبارہ گھنٹوں پر سر رکھ دیا تھا اور ایک بار پھر میرے اندر ماتم پیا ہو گیا تھا۔ میرے دل میں کوئی بیٹھا رو رہا تھا، سسک رہا تھا، بین کر رہا تھا لیکن یہ ماتم محبت کے پھڑ جانے کا نہیں تھا یہ ماتم تو اپنے بے شناخت ہونے کا تھا۔ میں کون تھی؟ کس کی بیٹی تھی؟ یہاں کیسے آئی تھی؟ اس وقت میں نے نہیں سوچا تھا میرا دک صرف یہ تھا کہ میں ان سب کی کچھ نہیں تھی۔ کمرے میں پھیلا ملجکا اندھیرا کم ہو گیا تھا شاید سورج نکل رہا تھا۔ میں ہولے سے اٹھی اور بوجھل قدموں سے واش روم میں جا کر آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن میری آنکھیں اسی طرح جل رہی تھیں اور ان میں بدستور ریت اڑتی رہی میں کیا کرنا چاہتی تھی اور مجھے کیا کرنا تھا میں نہیں جانتی تھی لیکن میں اپنی ضروری چیزیں اکٹھی کرتی پھر رہی تھی جیسے میں کسی کے زیر اثر تھی پھر میں نے اپنے ضروری کاغذات اور چند جوڑے کپڑے ایک بیگ میں رکھے تھے۔ مجھے آگے چل کر کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی میں نہیں جانتی تھی پھر بھی میں نے ایک بڑا اور ایک چھوٹا بیگ ضروری اور غیر ضروری چیزوں سے بھر لیا تھا۔ کیا میں اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی تھی؟ میں نے حیرت سے خود سے پوچھا تھا یہ گھر میرا شہر محبت اور میرے اندر سے جواب آیا تھا ہاں یہ گھر میرا نہیں ہے اس لیے مجھے یہاں نہیں رہنا تھا میں وہ ساری محبتیں بھلائی بیٹھی تھی جواب تک مجھے زندگی میں اس گھر میں ملی تھیں۔ میرے ذہن میں شاید یہ ہی رہ گیا تھا کہ میرا اس گھر اور اس کے کینوں سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس وقت مجھے وہ ننھا سا کاغذ بھی نہیں یاد رہا تھا جس نے میرے یقین کو پختہ کیا تھا "سمیعہ احمد ولد فصیح احمد" بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے میرے آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی تھی شاید میں رو رہی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر ریت اڑ رہی تھی۔ مجھے سب کے جاگنے سے پہلے یہ گھر چھوڑ دینا تھا، میں نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ٹیکل پر پڑا اپنا فون اٹھایا تھا اور تائید کو رنگ کیا لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ تو گوجر نوالہ جا چکی ہے تب جو پہلا

خیال میرے ذہن میں آیا وہ حسان کا تھا۔
"ہیلو!"

حسان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر میرے اندر جیسے سمندر اٹلنے لگے۔

"حسان!"

"کیا ہوا۔۔۔۔۔ کیا ہوا سمیعہ؟" ایک دم اس کی آواز سے نیند غائب ہو گئی۔

I Need Your Help (مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے)

"کیا ہوا سمیعہ فار گاڈ سیک کچھ بتاؤ تو۔" بے چینی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"حسان میں۔۔۔"

میری سسکی نکل گئی اور میں نے فون یکدم بند کر دیا۔ یہ میں نے حسان کو فون کیوں

کیا وہ بھلا کیا کر سکتا ہے وہ تو خود ہاسٹل میں رہتا ہے اور پھر حسان۔۔۔

میرا موبائل بج رہا تھا یہ یقیناً حسان تھا میں نے نمبر دیکھے بغیر پاؤر آف کر کے

اسے پرس میں ٹھونسا وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مجھے یہاں سے چلے جانا تھا بس۔۔۔

تائید کی ایک کزن نیکو کیپس ہوسٹل میں رہتی ہے فیصل آباد سے آئی تھی آج کا دن کم از کم اس

کے پاس رہ سکتی ہوں یہ خیال آتے ہی میں نے فائل سے کاغذ نکال کر روڈ کی طرف خط لکھا

تھا۔

"جان سے پیاری روی آج میں شہر محبت سے جلا وطن کر دی گئی ہوں میں

نہیں جانتی میں کہاں جاؤں گی لیکن یہاں اس گھر میں میرا کچھ نہیں ہے (کیا واقعی) خط

لکھتے لکھتے میں نے سوچا تھا کیا واقعی میرا یہاں کچھ نہیں تھا میرا بچپن، میرا لڑکپن، میری ہنسی،

میرے آنسو، میرے لفظ کیا کچھ نہیں ہے یہاں میرا۔ روی، ریان، پیما، بیبا۔

مما کہتی ہیں میں ان کی بیٹی نہیں ہوں میرا تم سب سے کوئی رشتہ نہیں اور اجنبی

لوگوں کا بھلا شہر محبت میں کیا کام۔ ممما، پیما، بیبا، تم اور ریان سب مجھے معاف کر دینا لیکن رومو

تھا۔

”اور تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں نے نظریں جھکا لیں۔

”تمہاری طرف ہی جا رہا تھا تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ تمہارا فون سننے کے بعد میں چادر اوڑھ کر سو جاتا۔ تم نے تو آرام سے I Need Your Help کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور وہاں مجھ پر کیا کیا گزر گئی کہ خدا جانے کیا ہوا ہے اور اب مڑے سے یہاں چہل قدمی کر رہی ہو۔“

وہ غصے سے کہتا مجھے ذرا بھی برا نہ لگا۔

”وہ میں نے سوچا تمہیں خواہ مخواہ پریشان نہ کروں۔“

”پریشان کرنے کے بعد سوچنے کا کیا فائدہ۔“

”Sorry حسان!“

میں شرمندہ ہو گئی۔

”بیٹھو ادھر اور بتاؤ کہاں جاتا ہے؟“

اس نے نیچے اتر کر میرا بیگ کھینچ لیا سیٹ پر بٹھکا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

”اب بتاؤ کیا ہوا ہے اور اس وقت کہاں جا رہی ہو بیگ سمیت؟“

”میں نے گھر چھوڑ دیا ہے حسان پلیز مجھے اس وقت نو کیپس ہوٹل میں چھوڑ دو۔“

”وہ۔“

میری آواز بھرا گئی۔ اس کے اسٹیرنگ پر دھرے ہاتھ ذرا دیر کو ساکت ہو گئے

تھے۔

”تم نے گھر چھوڑ دیا، لیکن کیوں۔“

حیرت، افسوس، دکھ کیا کچھ نہ تھا اس کے لہجے میں اور میرے اندر سے جیسے سوتے پھوٹ پڑے، رات بھر کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔ پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی وہ ادھر

میری جان میرے اندر تو دھول اڑتی ہے اب اور برسوں کی پیاس اور خشکی سے کانٹے اگلے رہے ہیں میرا پورا وجود بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے پتا نہیں جڑ بھی پاؤں گی یا نہیں۔ خدا تم سب کو ہمیشہ بہت خوش رکھے ریان کا بہت خیال رکھنا بہت زیادہ۔“

پھر اس سے آگے کچھ لکھا ہی نہ گیا میں نے قلم پونہی ٹھیل پر رکھ دیا اور خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے لگا جیسے میں نے کچھ اور لکھا تو میرا ضبط ختم ہو جائے گا اور میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں گی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا سب کے کمرے بند تھے صرف کچن سے برتنوں کی کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں شاید عیناں سب ملازمین کا ناشتہ بنا رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے لاؤنج کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی باہر پورج میں تینوں گاڑیاں کھڑی تھیں میں بیک کھینچتی ہوئی پچھلے لان کی طرف آئی اور پچھلا گیٹ کھول کر باہر سڑک پر آ گئی۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے حسان سے کہا تھا کہ وہ گھر نہ چھوڑے اور آج خود میں نے یہی کیا تھا حالانکہ اس گھر میں مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ مجھے وہ سب ملا ہوا تھا جو رومی یا ریان کے پاس تھا۔ نہ میں سنڈر یلا تھی اور نہ ہی ماما سنڈر یلا کی ماں کی طرح ظالم تھی۔ کیا میں خود غرض ہوں سڑک کے کنارے چلتے چلتے میں نے سوچا ابھی بہت صبح تھی اور مجھے کوئی رکشہ یا ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی اور دوسرے ہی لمحے میرے اندر جھک چلنے لگے تھے۔

”وہ میری بیٹی نہیں بیا آپ جانتی ہوتا۔“

کیا تھا اگر ماما یہ نہ کہتی وہ ۱۷ ہی رومی کی شاوی فیضان سے کر دیتی تو کیا میں منع کر دیتی رومی مجھے بھی تو بہت پیاری ہے اور اگر رومی کو۔۔۔ تو تب ہی ایک گاڑی کے بریک چمچڑائے تھے اور وہ قریب سڑک پر رک گئی اور پھر اس کا دروازہ کھولتے ہوئے حسان نے مجھے آواز دی تھی۔

”سو۔۔۔ سمیچ تم یہ کہاں جا رہی ہو؟“

اسکے لہجے میں حیرت تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا

ادھر مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

”خدا کے لیے سمیعہ اب بس بھی کرو نہیں تو میں بھی رونے لگوں گا یا گاڑی کسی درخت سے ٹکرا دوں گا، کچھ تو بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟“

اور تب اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتا رہا۔

”اور اب تم کیا کرو گی؟“

”پتا نہیں میں فی الحال تائید کی کزن کے پاس جا رہی ہوں۔ آگے مجھے کیا کرنا ہے شاید میں کہیں جاب کر لوں اور کسی ہاسٹل میں رہنے لگوں۔ پتا نہیں ابھی تو میرے اندر سے خون رستا ہے حسان ابھی تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“

”تم نے اس طرح گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا سمیعہ، تمہیں وہاں ہی رہ کر اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا کہ ممتا تمہاری سگی ماں نہیں باقی سب لوگ تو تمہیں بہت چاہتے ہیں اور وہ نازک سی لڑکی روی جو تمہارے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتی وہ کیا کرے گی۔“

میں نے حسان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن میرے آنسو پھر بہنے شروع ہو گئے تھے۔

”اچھا پلیز رو تو مت، میں سوچتا ہوں کچھ اچھا چلو فی الحال میں تمہیں اپنی کزن کے گھر لے چلتا ہوں۔ مدحت میرے ماموں کی بیٹی ہے میری بہت اچھی دوست ہے وہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں آج کل اس کے ہسپتال کسی کانفرنس میں شرکت کرنے اٹھلینڈ گئے ہوئے ہیں وہاں تم آرام سے رہ سکتی ہوں بے فکر ہو کر۔“

”پلیز حسان مجھے تم کسی ویمن ہوسٹل میں ایک کمرالے دو نا۔ درکنگ ویمن کے لیے ایسے کئی ہوسٹل ہیں تاہم لاہور میں۔“

”اوکے کر لیں گے کچھ، فارگاہ ڈیسک اس وقت خود کوریٹکس کر لوہہ جو کیا کہے گی کہ میں تمہیں۔۔۔“

”تم نہیں جان سکتے حسان میں اس وقت کس کرب سے، کس اذیت سے گزر

رہی ہوں۔ پوری رات میں نے کیسے گزاری ہے یوں لگتا تھا جیسے اس رات کی کبھی صبح نہ ہوگی کتنی طویل رات تھی حسان۔“

حسان خاموش ہی رہا تھا۔ مدحت اتنے سویرے حسان کے ساتھ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا شاید اسے اپنے احساسات پر بہت قابو تھا۔ حسان نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی شاید سب کچھ بتا دیا تھا اسے، کیونکہ مجھے ڈرامائیگ روم میں بٹھا کر وہ اس کے پیچھے ہی کچن میں چلا گیا تھا۔

”سمیعہ تم ریلکس ہو کر بیٹھ جاؤ میں دیکھتا ہوں ذرا وہ ناشتے میں کیا بنوانے لگی ہے۔ بھی مجھے تو سخت بھوک لگی ہے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کی بی بی بہت مزیدار پرائیڈ پکاتی ہے۔“

وہ لہجہ کو خوشگوار بناتا مجھے ہدایت دیتا باہر نکل گیا تھا لیکن مجھے لگا تھا ایک بار پھر میرا وجود پتھر ہو گیا تھا۔ میں ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی تھی میری آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور ان میں ریت بھری ہوئی تھی۔ میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں؟ میں نے کیوں گھر چھوڑا ہے؟ کم از کم میں چاہے، بچا ہے۔۔۔

میں سوچ رہی تھی جب مدحت میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بہت آہستہ سے میرے کندھوں کو چھوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی تھی اور لہجہ میں محبت کا نرم نرم سا تاثر۔

”تم ناشتہ کر کے ایک ٹیبلٹ لے کر سو جاؤ، رات بھر کی جاگی ہوئی ہو اگر گھر فون کرنا چاہو تو کر لو وہ لوگ پریشان ہوں گے۔“

میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں مجھے فون نہیں کرنا میں نے خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔“ میں نے خود کو کہتے سنا اور پھر اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ میں فیضان کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ ممتا، حسان، ریان اور روی کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ سامنے بیٹھے حسان کی نظریں مجھے اپنے

”یہ ایک انٹر کانج ہے اس کے ہوٹل کے لیے وارڈن چاہیے۔ اخبار میں اشتہار آیا تھا میں نے تمہارے بچہ زنجیج دیے ہیں۔ انٹرویو کے لیے جانا ہے کل، ویسے اس کانج کا مالک مجھے جانتا ہے۔“

چار دن بعد اس نے بتایا، ان چار دنوں میں میں نے کتنی ہی دعائیں کر لی تھیں میں نے اور شاید اللہ نے میری دعائیں لی تھیں۔ یہ جاب میرے لیے بہت مناسب تھی رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور شاید حسان نے اسی لیے اسے منتخب کیا تھا۔ یہ کانج قصور میں تھا۔

”یہ ایک پرائیویٹ کانج ہے شاید سیلری اچھی نہ ہو۔“

”کوئی بات نہیں حسان۔“

فی الحال تو مجھے سر چھپانے کا ٹھکانہ چاہیے تھا۔ یہ جاب مجھے مل گئی تھی جب میں حسان کے ساتھ جا رہی تھی تو مدحت نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”تم گھر میں فون ضرور کر لیتا سوئی!“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں جیسے ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔

”سمیہ! کیا تم فیضان سے محبت کرتی تھیں؟“ راستے میں حسان نے مجھ سے پوچھا۔

”ان دنوں تم بہت خوش نظر آتی تھیں۔ تمہاری آنکھوں اور چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھرے تھے جیسے تمہیں بہت کچھ مل گیا ہو، ایسا جو مال و دولت سے بڑھ کر ہو جیسے کسی کی محبت۔۔۔“

شاید یہ وہ بات تھی جو بچھلے کئی دنوں سے وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن پوچھ نہیں سکتا تھا۔

”ہاں نہیں!“

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا لیکن اندر ہر طرف سناٹا تھا اور خاموشی تھی، تب میں نے

چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں، وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مدحت نے اسے کچھ کہا تھا میں نے سنا نہیں تھا شاید میری سماعتیں ایک بار پھر گونگی ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ناشتہ آ گیا، مدحت نے خود میری پلیٹ میں آلیٹ اور سلاکس رکھے۔

”بی بی پراٹھے بنا رہی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

میں بالکل میکا کی انداز میں کھانے لگی۔ چائے کے ساتھ مدحت نے مجھے ایک چھوٹی سی ٹکونی گولی دی تھی شاید نیند کی گولی تھی۔ بغیر کچھ کہے وہ گولی میں نے کھالی۔ میں غور اس سارے ماحول سے غافل ہو جانا چاہتی تھی۔ ناشتے کے بعد مدحت مجھے گیٹ روم میں لے آئی۔

”تم آرام سے سو جاؤ کوئی تمہیں ڈمٹب نہیں کرے گا۔“

پھر تین دن میں مدحت کے گھر رہی تھی۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میرے بعد رومی، ریان اور بیا کا کیا حال گا۔ پتا نہیں میں اتنی خود غرض کیوں ہو گئی تھی۔

مدحت بہت پیاری، بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں گھر لوٹ جاؤں۔ اس نے میرے گھر چھوڑنے کے عمل کو پسند نہیں کیا تھا لیکن اس نے مجھے واپس جانے کو مجبور نہیں کیا تھا مگر مجھے ہمیشہ یہاں تو نہیں رہنا تھا۔ چند دن بعد اس کا شوہر واپس آ جاتا اور میں چاہتی تھی کہ اس سے پہلے ہی کوئی انتظام کر لوں اور یہی بات میں نے حسان سے کہی تھی جب حسب معمول وہ شام کو آیا۔

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں لیکن سوئی۔۔۔۔۔“

”پلیز مجھے گھر واپس جانے کو مت کہنا، جو راستے چھوڑ آئی ہوں وہاں پلیٹ کر نہیں جاتا مجھے۔“

”پاگل ہو تم سمیہ!“

اس نے تبصرہ کیا تھا لیکن اس سب کے باوجود اس نے میرے لیے جاب کا بندوبست کر لیا تھا۔

سانے دغڈ سکرین سے باہر نظریں جمائے جمائے سوچا تھا کیا مجھے فیضان سے محبت تھی۔۔۔؟ شاید اس وقت میں خود کو بھی اس کا صحیح جواب نہیں دے سکتی تھی میرا اہنا۔۔۔ اپنی ذات کا دکھ محبت کے دکھ سے زیادہ بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ میں نے یہ تک نہیں سوچا کہ میں کون ہوں۔ اگر میں ماما کی بیٹی نہیں ہوں تو پھر میرے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ اور پورا ایک ماہ گزر جانے کے بعد ایک شام اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے میں نے یہ بات سوچی تھی کہ میرے ماں باپ کہاں ہیں۔ کیا ماما پاپا نے مجھے کسی یتیم خانے سے یا ایڈجی ہوم سے لیا تھا۔ آٹھ برس تک ماما کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی تب شاید انہوں نے سوچا ہو کہ مجھے گود لیے لینا چاہیے۔ اس ماہ میں گود میں پوری طرح سنبھل چکی تھی تاہم میرے اندر کا سکوت کبھی کبھی ٹوٹ جاتا تھا خصوصاً جب حسان آتا تھا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر مجھے ملنے ضرور آتا تھا اور اسکے جانے کے بعد پھر وہی سناٹے اندر بسیرا کر لیتے تھے۔ میں خود اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھی۔ کبھی کبھی آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی یوں لگتا جیسے باہر دروازے پر رومی دستک دے رہی ہو، اس کی آواز میری ساعتوں میں گونجنے لگتی تھی۔

”سوی دروازہ کھولو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں تنویری کیفیت میں دروازے تک جاتی، باہر کوئی نہ ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کسی لڑکی کے کمرے میں مدھم روشنی ہوتی اور کہیں سے باتوں کی آوازیں آرہی ہوتیں۔

میں ایک گرلز ہوسٹل میں تھی۔ رومی یہاں کہیں نہیں تھی اور تب میرا دل چاہتا کہ دیواروں سے سرخ شیخ کر چیخ کر روؤں اور روتی چلی جاؤں لیکن پھر میں ہونٹ بھینچ کر آنکھیں سختی سے بند کر لیتی۔ اس روز حسان کی گاڑی میں بیٹھ کر میں جو روئی تھی اس کے بعد پھر اندر صحرانگ آئے تھے۔ دور تک کہیں پانی کا قطرہ نہ تھا حالانکہ میں اس بڑے دکھ پر ہر روز رونا چاہتی تھی۔

”حسان! کہیں میں اپنی مریض تو نہیں بن گئی۔ کیا تمہیں لگتا ہے میں پاگل ہونے والی ہوں؟“

”نہیں!“ وہ سنجیدگی سے کہتا۔ ”تم بالکل نارمل ہو، دراصل تمہیں شاک لگا ہے اس لیے۔ ہولے ہولے سنبھل جاؤ گی۔“

”سنو حسان!“ میں اس سے کہتی۔

”وعدہ کرو میں اگر پاگل ہوگئی تو تم مجھے اپنے سینٹل ہاسپٹل میں رکھو گے، دیکھو مجھے کسی پاگل خانے میں داخل نہ کروا دینا۔ وہاں دیکھی تھی نامریض کی حالت۔“

”یکومت!“

حسان مجھے ڈانٹ دیتا لیکن وہ مضطرب سا نظر آتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو جاتا، ٹپکتے ہوئے بار بار مجھے دیکھتا۔ میں جانتی تھی وہ میرے لئے پریشان ہے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں پاگل ہو رہی ہوں کئی بار میں نے سوچا تھا۔

اور جب ایک ویک اینڈ پر حسان آیا تو میں نے اس شام سوچی ہوئی بات اس سے کہہ ڈالی۔

”حسان! میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ میرے والدین کون ہیں کیا ایسا ممکن ہے مجھے پتا چل جائے کبھی میں کون ہوں۔“

”تم نے اب سوچا ہے سمیعہ! جبکہ میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا لیکن میں چاہ رہا تھا تم خود سوچو، تمہارے اندر یہ خیال پیدا ہو۔“

”تو یہ کیسے پتا چلے گا حسان؟“

”یہاں کو فون کر کے پوچھ لو۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”نہیں!“ میرے ہونٹوں سے فوراً نکلا۔

”نہیں! مجھے وہاں فون نہیں کرنا۔“

”تو پھر کیسے پتا چلے گا؟“

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میرے اندر مایوسی پھیلنے لگی تھی۔ یہ بہت مشکل تھا اس طرح معطوم ہونا۔۔۔۔۔

”سنو!“ مجھے ایک دم یاد آیا۔

”ایک بار میں نے اپنا برتھ سرٹیفکیٹ دیکھا تھا اس پر لکھا تھا۔ سمیعہ احمد ولد فصیح احمد، جائے پیدائش عزیز ہاسپٹل۔“

”تو کیا۔۔۔۔۔ آئی من کیا تمہارے پیا فصیح احمد ہی ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری ممانگی نہیں ہیں۔ کیا خبر تمہارے پیانے دو شادیاں کی ہوں۔“

”ہاں ایسا ہی ہوگا حسان!“

”اور پھر بھی تم نے گھر چھوڑ دیا سمیعہ! وہ سب تمہارے اپنے ہی تو تھے صرف ممان۔۔۔“

”حسان میرے ساتھ چلو گے عزیز ہاسپٹل۔ وہاں سے ضرور چٹا چل جائے گا میری ممان کا نام۔“

”ہاں لیکن۔۔۔“

”پلیز چلنا!“

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو میرا اس قدر خیال رکھتا تھا۔ ہر جگہ مجھے ملنے آتا تھا وہ حق دوستی نہمارہا تھا اور میں تھی کہ۔۔۔

”Sorry حسان! میں تمہیں بہت تنگ کرتی ہوں نا۔ تم بہت اچھے ہو تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں زندگی بھر کبھی تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔“

”بکومت!“ اس نے مجھے ڈانٹا۔

”دوستی کے رشتے میں احسان، شکر یہ یا Sorry نہیں ہوتا۔“

لیکن حسان جس طرح ہر قدم پر میرے ساتھ تھا، کیا کوئی کسی کے لیے یوں بے غرض ہو کر، کر سکتا ہے، لیکن حسان تو تھا ہی ایسا ہر ایک کے لیے مخلص۔ ہاسپٹل کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا تھا۔

”24 سال پہلے کا ریکارڈ۔۔۔ لیکن ہم آپ کو کس طرح دکھا سکتے ہیں۔ آپ پہلے ڈاکٹر عزیز سے بات کریں۔“ حسان جس شخص کے سامنے کھڑا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ جب ہی سامنے سے ایک نرس آئی۔

”کیا بات ہے حمید صاحب!“

”وہ میڈم، یہ صاحب 24 سال پہلے اس ہاسپٹل میں پیدا ہونے والے بچوں کا ریکارڈ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”خیریت ہے جناب آپ کیوں یہ ریکارڈ دیکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ خاتون اب حسان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ غالباً اس ہاسپٹل کی ایڈمنسٹریٹر تھی۔

”دراصل میم یہ میری کزن ہے اسی ہاسپٹل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے ب فارم اور میٹرک کی سند میں جو اس کی تاریخ پیدائش ہے وہ غلط ہے۔ یہ اپنی

مجھ ڈیٹ آف برتھ معلوم کرنا چاہتی ہے۔“

حسان باتیں بنانے میں تو ماہر تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”سمیعہ احمد میرے پیا فصیح احمد ہیں۔“

”فصیح احمد!“

میڈم نے آنکھیں پکڑیں۔

”وہ جو آرکیٹکٹ ہیں ان کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی ہے اور۔۔۔“

”ہاں ہاں وہی۔“ میں بے ساختہ بولی تھی۔

”مجھے بالکل یاد ہے یہاں ان کی بیٹی پیدا ہوئی تھی، اسی ہاسپٹل میں اور ان کی

سز آج کل ایم این اے ہیں۔“ خاتون کی یادداشت غضب کی تھی۔

”اس ہاسپٹل کا نقشہ فصیح احمد نے ہی بنایا تھا اور اس ہاسپٹل بنانے کا ٹھیکہ بھی ان کی کنسٹرکشن کمپنی کو دیا گیا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی سز بھی

بڑے سارے برآمدے میں سامنے دیوار کے ساتھ لکڑی کے بیچ پڑے ہوئے تھے جن پر مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف عورتیں اور دوسری طرف مرد۔ میں بھی اس لڑکی کے ساتھ بیٹھ گئی لڑکی کے ساتھ اس کی ایک روم میٹ بھی تھی۔ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو بالکل سامنے بیٹھا شخص جو ادھیڑ عمر کا تھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ جھک کر اپنے ساتھ بیٹھی سانولی سی قدرے موٹی عورت کو سرگوشی میں کچھ کہتا اور پھر میری طرف دیکھنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی یہ شخص مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ میں بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر بیٹھ گئی۔ میری ساری حسیں یکدم بیدار ہو گئیں تھیں۔ یہ شخص ضرور کوئی غلطہ ہے حالانکہ شکل سے وہ خاصا مسکین لگ رہا تھا۔ یہ ضرور ہمارا تعاقب کر کے جان لے گا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور کیا خبر یہ لڑکیوں کو اغواء کرنے والے کسی گروہ سے متعلق ہو۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ میں نے غور کیا وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی توجہ قریب بیٹھی لڑکیوں کی طرف نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے ہماری باری آئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی اس کے آگے تین چار مرد بیٹھے تھے۔ میں ڈاکٹر کے روم سے نکل کر تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جا رہی تھی کہ یکدم مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی تھا۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا۔

”سینس پلیز رکیں۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو میں بالکل غیر ارادی طور پر رک گئی میں شاید اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں اس سے خوفزدہ ہوں۔

”وہ۔۔۔ وہ میں بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا تھا، تمہاری شکل عارفہ سے بہت ملتی ہے بلکہ تم تو نبی بٹائی عارفہ ہو بالکل دیباہی قد بت، ویسی ہی رنگت وہی آنکھیں۔ میں سچ کہتا ہوں تمہیں دیکھ کر مجھے پہلے یوں ہی لگا تھا جیسے عارفہ کو دیکھ رہا ہوں۔ تم یقیناً عارفہ کی بیٹی ہو۔“

ساتھ تھیں اور چھوٹی بیٹی بھی۔ غضب کی مشابہت ہے تم میں اور اس میں۔“
خاتون کو غالباً بولنے کی باری تھی۔ میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی رومی اور مرا کے ذکر سے۔

”وجہ۔۔۔ ہاں یہی نام ہے ناتھمہاری ماں کا۔ وہ جب یہاں ہمارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئی تھیں تو بہت گھبراہٹ ہوئی تھیں، بہت خوفزدہ تھیں۔ شادی کے کافی عرصہ بعد ان کی اولاد ہوئی تھی نا۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دیتی رہتی تھی کہ میں خود دس سال بعد ماں بنی تھی لیکن وہ تو بہت ڈرتی تھی کہ کہیں پیچیدگی نہ ہو جائے کوئی، لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا نارمل کیس ہوا تھا اور دو دن بعد ہاسپٹل سے فارغ ہو گئیں تھیں۔“

میں نے الجھ کر حسان کی طرف دیکھا تھا۔ حسان خود بھی الجھ گیا تھا اور ان خاتون کی مدد سے وجیہ فصیح احمد کی فائل بھی مل گئی تھی۔

”اور تم یونہی خواہ خواہ۔۔۔“

حسان بے حد ریلکس ہو گیا تھا ماما کا نام دیکھ کر لیکن میں تو اور الجھ گئی تھی۔

”خواہ خواہ نہیں حسان! میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ زبان سے صرف ایک بار سنا لیکن ان کے ردیوں نے کئی بار احساس دلایا۔“

”چلو پہلے گھر چلتے ہیں بیا سے۔۔۔“

”نہیں حسان واپس قصور لے چلو مجھے۔“ میرے لہجے کی سختی نے حسان کے لبوں

سے مسکراہٹ چھین لی تھی پھر سارا راستہ اس نے بات نہیں کی۔

اب یہ گتھی شاید کبھی نہ سلجھ سکے۔ میں نے تب سوچا تھا لیکن کبھی کبھی وہ ہو جاتا ہے جو ہمارے تصور میں نہیں ہوتا اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ گتھی جو میرے خیال میں کبھی نہیں سلجھ سکتی تھی اچانک سلجھ گئی۔ شام کو روم نمبر اٹھارہ کی ایک لڑکی کی طبیعت خراب ہو گئی اسے واسٹنگ ہو رہی تھی اور بخار بھی بہت تیز تھا۔ لڑکیوں نے مجھے بتایا تو میں اسے قریبی ڈسپنسری پر لے گئی۔ اس ڈسپنسری میں صرف ایک ڈاکٹر بیٹھا تھا اس لیے اچھا خاصا مارش تھا۔

اب میں ہوں بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن تم لوگ تو لاہور میں رہتے تھے۔ تم یہاں کیسے ہو اور یہاں اس ڈپٹری

میں۔ کیا فصیح احمد کا کاروبار تباہ ہو گیا ہے؟“

اب کے میں چوکی تھی۔

”آپ کو میرے پیا کا نام کیسے پتا چلا؟“

”تو تم فصیح احمد کی بی بی ہونا! میرا خیال صحیح تھا بلکہ یقین تھا کہ تم عارفہ کی بی بی ہو۔

بنی بنائی عارفہ ہوتی، لیکن شمو کو کتنی تھی میں پاگل ہو گیا ہوں دنیا میں بہت سے لوگوں کی شکلیں ملتی ہوں گی بھلا یہاں اس ڈپٹری میں اتنے امیر باپ کی بی بی کیونکر آئے گی۔“

میرے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔

”لیکن میری ماما کا نام تو عارفہ نہیں ہے۔“

میں نے خود کو کہتے سنا تھا۔

”ہاں وجیہ نام ہے نا تمہاری ماں کا، لیکن وہ تمہاری سگی ماں نہیں ہے۔ شاید تمہیں

پتا نہیں ہے۔“

”مجھے علم ہے۔“

میں نے سر جھکا لیا تھا۔ میرے اندر مل چل چکی تھی جیسے کسی نے ساکن ندی میں

ایک ساتھ کئی پتھر پھینک دیے ہوں اور پھینکتے چلا جا رہا ہو۔

”تو فصیح صاحب نے تمہیں بتا دیا حالانکہ انہوں نے کہا تھا میں کبھی تم سے ملنے نہ

آؤں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں کبھی پتا نہ چلے کہ تم وجیہ بی بی کی سگی بی بی نہیں ہو۔“

اب ضبط کی طنائیں میرے ہاتھوں سے گرنے لگی تھیں۔ راتوں کی تنہائیوں میں جو

میں نے بے آواز لڑیوں سے دعا کی تھی وہ اللہ نے سن لی تھی۔

”آپ کون ہیں اور عارفہ۔۔۔؟“

میری آواز لرز رہی تھی۔ ”وہ کہاں ہیں؟“

”میں تمہارا ماموں ہوں اور عارفہ وہ بے چاری تو تمہاری پیدائش کے پانچویں

دن ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔“

ایک دم جیسے دل کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

”اصل میں اسے بی بی تھا نا لیکن تم یہاں کیوں ہو اور فصیح صاحب کہاں ہیں؟“

”میں یہاں جاب کر رہی ہوں پتا تو وہاں ہی لاہور میں ہیں۔“

”لیکن بھلا تمہیں جاب کی کیا ضرورت تھی؟“ اب وہ پوچھ رہا تھا۔

”مجھے بس شوق تھا۔“

میں نے مڑ کر لڑکیوں کو دیکھا جو مجھے باتیں کرتے دیکھ کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی

تھیں۔

”اچھا اچھا!“

اس نے سر ہلا کر پیچھے دیکھا اور اس موٹی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ تمہاری ماما ہے، کھانسی ہے اسے۔“

پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔

”شمو ڈاکٹر صاحب کو دکھا کر خود ہی آ جانا ادھر یہ اپنی عارفہ کی بی بی ہے نا میں اس

کے پاس کھڑا ہوں۔“

بات کر کے وہ شخص پھر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے

محبت نظر نہیں آئی تھی بس سپاٹ سی نظریں تھیں۔

”آپ فصیح احمد۔۔۔ میرا مطلب ہے پتا کو کیسے جانتے تھے؟“

وہ میرے ابا ان کے آفس میں کلرک تھے۔ رفیع صاحب کے زمانے سے ہی نا، تو

بہت عزت کرتے فصیح صاحب ان کی۔ فصیح صاحب کی اولاد نہیں تھی نا شادی کو آٹھ برس

ہو گئے تھے تو۔“

تب ہی وہ خاتون جو بقول ان کے میری ماما تھی ہمارے قریب آ گئی۔

”دیکھ میں نہ کہتا تھا کہ یہ ہماری عارف کی بیٹی ہے۔“ وہ اب اس سے باتیں کرنے لگے تھے۔ خاتون کچھ دیر تک تو ان کی بات سنتی رہی اور میری طرف تنقید نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس شخص سے جس نے خود کو میرا ماموں بتایا تھا شاید ایک ایک بات اسے بتادی تھی تب ہی انہوں نے میری طرف رخ کیا۔

”کہاں لو کر رہی کرتی ہو اور رہتی کہاں ہو؟“

”گرلز کالج کے ہوٹل میں یہ ساتھ ہی۔“

”اچھا اچھا وہ جو ادھر بانٹا شو کے ساتھ ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”چلو نا ہمارے گھر، شبیر! لے چلو اسے اپنے گھر بچے خوش ہوں گے اپنی پھپھی کی بیٹی کو دیکھ کر۔“

”ہاں ہاں چلو نا بیٹی۔“

اب کے پہلی بار اس شخص نے مجھے بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔

”لیکن وہ کہیں فصیح احمد صاحب ناراض نہ ہوں یہ سوچ لو۔۔۔“

اب وہ آدمی بات اپنی بیوی سے کر رہے تھے۔

انہوں نے وعدہ لیا تھا اب اسے کہ ہم لوگ کبھی۔۔۔“

”ارے چھوڑو بھاڑ میں گیا وعدہ۔ ہماری بیٹی ہے ہمارا حق نہیں ہے کیا اور پھر

اسے کہہ دو نا، گھر نہ بتائے جا کر اپنے ماں باپ کو۔“

”کیوں بیٹی چلو گی نا ہمارے ساتھ ہمارے گھر؟“

وہ شوہر سے بات کرتے کرتے اچانک میری طرف دیکھتی تھی میں جو ہونٹ بنی ان کی باتیں سن رہی تھی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

ماشاء اللہ سے دو بہنیں ہیں تمہاری۔ نمن بھائی ہیں۔ لو اب کیا خون سے خون جدا ہو سکتا ہے۔ میاں صاحب نے چار لکے دے کر کیا سمجھ لیا تھا کہ خون۔۔۔۔۔“

”چار لکھے!“

میرا دل جیسے ڈوب گیا تھا تو یہ میرے رشتے دار میرے سامنے کھڑے ہیں انہوں نے مجھے پیانے کے پاس بچ دیا تھا، میں یکدم مڑی تھی۔

”میڈم پلیز چلیں نا، سائرہ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔“

اس کی روم میٹ نے کہا تو میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل

پڑی۔

”تو یہ تھی تمہاری شناخت اب خوش ہو جاؤ یہی جاننا چاہتی تھی نا تو جان لیا اب کیا کر لو گی۔“ میرا دل خود ہی میرے مقابل کھڑا ہو کر سوال کر رہا تھا وہ میرے والد، کیا وہ بھی میری ماں کی طرح اس دنیا میں نہیں ہیں۔

میں پوچھنا چاہتی تھی اس لئے میرے قدموں کی رفتار مدھم پڑ گئی تو وہ دونوں تقریباً دوڑ کر میرے قریب آئے۔

”چلو نا ہمارے ساتھ گھر!“ عورت نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”زیادہ دور نہیں ہے قریب ہی ہے۔“

مرد یعنی شبیر ماموں مجھے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں آج نہیں، اس بچی کی طبیعت خراب ہے اسے لے کر مجھے ہوٹل جانا ہے پھر کبھی چلوں گی۔“

میں ایسا کہنا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے لبوں سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں اتوار کو آ جاؤں گا تیرے ہوٹل، دیکھا ہوا ہے میں نے، لے جاؤں گا ساتھ۔“

”آپ کہیں گے گا باہر چوکیدار سے کہ میڈم سمیعہ احمد سے ملنا ہے۔“

میں بات کر کے تیزی سے لڑکیوں کے مقدم ہو گئی اپنے کمرے میں آتے ہی میں بیڈ پر گر پڑی۔ وہ شخص کیا واقعی سچ کہہ رہا تھا کیا خبر جھوٹ بول رہا ہو۔ کاش میری ماں

دل میں ایک درد سا اٹھا تھا۔

میری اپنی سگی ماں۔

اور باپ۔ اس شخص نے میرے باپ کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا تھا پتا نہیں وہ کہاں ہیں زندہ بھی ہے یا نہیں اور یہ لوگ سچے ہیں یا فراڈ لیکن پھر یہ ماما کا نام کیسے جانتے ہیں انہیں کیسے پتا ہے وہ میری سگی ماں نہیں ہیں۔ یقیناً یہی سچ ہے جو انہوں نے کہا تھا۔
”حسان!“

کچھ دیر بعد میں اسے فون کر رہی تھی وہ ساری بات سن کر جھنجھلایا۔

”احق لڑکی یہ کوئی فلمی ستوری نہیں ہے کہ اچانک پھڑے عزیز ورشتہ دار مل گئے۔ خدا جانے کون فراڈ لوگ تھے تھینک گاؤ کہ تم ان کے ساتھ نہیں گئیں۔“

”نہیں وہ فراڈ نہیں تھے حسان!“

”تمہیں الہام ہو رہا ہے۔“ وہ جھنجھلایا۔

”میرے دل نے گواہی دی ہے کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ ماما کا نام تو وہ معلوم کر سکتے ہیں لیکن یہ بات وہ نہیں جان سکتے کہ وہ میری سگی ماں نہیں ہے۔“ ایک لمحہ کو حسان چپ کر گیا۔

”پھر بھی تم اکیلی ان کے ساتھ نہیں جاؤ گی۔ میں اتوار کو آؤں گا تو اکٹھے چلیں گے۔ دیکھتا ہوں کیا ثبوت ہیں ان کے پاس۔“

اور ایسا ہی ہوا تھا جب میں اور حسان ماموں کے ساتھ ان کے گھر گئے تو حسان نے پوچھا تھا۔

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ سمیہ آپ کی بھانجی ہے؟“

”آپ فصیح صاحب سے پوچھ لیں۔ آخر ناخن سے گوشت جدا تو نہیں ہو سکتا

حالانکہ میاں صاحب تو یہی چاہتے تھے لیکن اللہ نے خود ملایا دیا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو

میاں ہم سے تو بعد میں ثبوت مانگنا۔“

مامی اچانک ہی اس بیٹھک نما کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”میرا کزن ہے ماموں کا بیٹا۔“ مجھے ہی جواب سوچا تھا۔

”ارے واہ ماموں تو تمہارے یہ ہیں، یہ کہو تمہاری سوتیلی ماں کا بھتیجا ہے۔“

”اچھا اچھا!“

شبیر ماموں نے سر ہلا دیا۔

”نجیب صاحب کے بیٹے ہو۔ جب میں لاہور سے آیا تھا تو اس وقت امریکہ

جار ہے تھے۔ کیا اب پاکستان آگئے ہو؟“

حسان نے سر ہلا دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں۔۔۔

یہ ایک چھوٹا سا پختہ مکان تھا۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے اس میں چند کرسیاں

اور ایک میز تھی، ایک طرف ایک پنک بھی تھا۔

”آپ کیا پہلے لاہور میں تھے؟“

”جی جی!“

شبیر ماموں حسان سے کافی مرعوب سے لگ رہے تھے۔

”اچھرہ میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے پھر جب روپے مل۔۔۔“

وہ ذرا سا رکا یہاں سستا مکان مل رہا تھا اور میرا ایک رشتہ دار یہاں رہتا تھا خرید

لیا اور ادھر پیچھے کی طرف دکان بنالی۔ اچھی چلتی ہے گزارا ہو جاتا ہے۔ وہاں لاہور میں جو

کچھ کماتا وہ آدھا کرائے اور بجلی، گیس کے بلوں پر اٹھ جاتا تھا۔“

”نسرین، عاصمہ کہاں ہو بھئی؟“

مامی نے دروازے کے پاس جا کر آواز دی تو دونوں لڑکیاں اندر آ گئیں۔

”یہ عاصمہ ہے بارہ جماعتیں پڑھ لی ہیں اس نے، اب گھر میں ہی رہتی ہے

اور یہ نسرین اس نے دس جماعتیں پڑھ لیں ہیں۔ بس اگلے ماہ اس کا بیاہ ہے۔“

وہ دونوں قبول صورت تھیں اور لباس بھی زمانے کے مطابق پہن رکھا تھا۔ بڑی میری عمر کی ہوگی۔ وہ دونوں اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔
”بھائی کہاں مر گئے تمہارے۔“

وہ لڑکیوں سے مخاطب تھی۔ تب ہی دو لڑکے اندر آ گئے ایک شلواری قمیض میں لباس تھا۔

”یہ نوید ہے۔ اپنے ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے۔ اس کا نمبر دوسرا ہے بڑا اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ کسی کام سے فیصل آباد گیا ہے اور یہ چھوٹا ہے سعید۔“
اس نے دوسرے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جنرل پہن رکھی تھی۔
”نوکری کرتا ہے چودہ جماعتیں پاس کر رکھی ہیں۔“

حسان بالکل خاموش بیٹھان کی باتیں سن رہا تھا۔ یکدم مجھے احساس ہوا کہ مجھے حسان کو یہاں لے کر نہیں آتا چاہیے تھا اور نہ ہی حسان کو یہ سب بتانا چاہیے تھا، کیا سوچے گا وہ۔ میری کیا وقعت رہ جائے گی اس کی نظر میں میرا یہ بیک گراؤ ٹی۔ خیر اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا حسان اس طرح کا نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے فروخت کیا تھا میں تو خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔

میں خود ہی ہر بات اخذ کرتی جاتی تھی اور مجھے یکدم گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

”چلیں حسان!“ میں نے حسان کی طرف دیکھا۔

”ارے نہیں، نہیں بیٹی! پہلی بار اپنے ماموں کے گھر آئی ہو تو بغیر کھائے پیئے چلی جاؤ گی اور خالی ہاتھ۔“

شبیر ماموں نے جس طرح کہا تھا میرے دل میں یکدم گداز سا پیدا ہوا اور میں نے ان کے لیے اپنے دل میں لگاؤ سمجھوس کیا۔

”نرسن، عاصمہ فافٹ کھانا لے آؤ ادھر ہی، تیار ہے نا۔ چائے بھی فوراً لے

آتا۔“

دونوں لڑکیاں فوراً اٹھ گئی تھیں۔ نوید بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

”ابا میں دکان پر جا رہا ہوں۔“

جبکہ سعید ایک کرسی پر بیٹھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے اور حسان کو دیکھنے لگتا تھا۔

حسان جو میرے کہنے پر اٹھ کھڑا ہوا تھا مجھے اٹھتے نہ دیکھ کر پھر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے سر ہلا دیا حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

پھر بھی میں اس روز کے بعد کئی بار ماموں کے گھر آئی تھی۔ میں نے دل سے انہیں ماموں تسلیم کر لیا تھا۔ ایک روز ماموں نے مجھے میری ماں کی تصویر دکھائی یہ ان کے سکول کی تصویر تھی۔ شاید فیئر ویل پارٹی کی وہ تمن چار لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھیں لیکن میں نے انہیں پہچان لیا۔ ماموں نے صحیح کہا تھا مجھے یوں لگا جیسے یہ میری تصویر ہے۔ میری پندرہ سولہ سال کی عمر کی تصویر۔

”کیا کوئی اور تصویر نہیں ہے امی کی؟“

میں نے ماموں سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا کہ

”ایک دواور تھیں تو، ڈھونڈو کا اگر مل گئی تو۔“

میں اب اکثر چلی آتی تھی گھنٹہ دو کے لیے۔ مجھے لگا تھا کہ میں نارمل ہو رہی ہوں ایک جامدی چپ تھی وہ ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے Accept کر لیا تھا کہ دنیا میں میرے واحد رشتہ دار یہی ہیں۔ میں ہفتے میں ایک بار ضرور آتی تھی شروع میں ایک دو بار میں حسان کے ساتھ آئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ اس گھر میں حسان کی آمد کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ حسان باقاعدگی سے ہر اتوار کو آتا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ جو اتنی دور سے میرے لئے آتا ہے مجھے نہ پا کر ہزار ہو۔ چنانچہ میں ہفتے کو کالج سے فارغ ہو کر شبیر ماموں کی طرف چلی جاتی تھی لیکن بے حد اصرار کے باوجود وہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ شبیر ماموں کے گھر کا ماحول ایسا ہی تھا جیسے نچلے متوسط طبقے میں ہوتا تھا۔ مامی کا بات کرنے کا انداز ہمیشہ طنزیہ ہوتا میں سوچتی تھی کہ مامی شاید کسی اور انداز میں بات ہی نہیں کر سکتیں، نرسن کے پاس

شاید ماما سے ایک بار پوچھا اور اب ماموں سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے ماموں کی آنکھوں میں حیرت کو پھیلنے دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر سکتے تھے تب ہی پاس بیٹھی ماما نے انہیں کہنی مارتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”لو تمہارے ابا تو پہلے ہی دنیا سے گزر گئے تھے۔ عارفہ بے چاری کو تو وہی غم لے

ڈوبا۔“

”اماں!“

وحید کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔

”تیری یہ بیچ میں بولنے والی عادت زہر لگتی ہے مجھے۔ کیا یاد آ گیا تجھے؟“

”کچھ نہیں اماں، تو چلا اپنی کہانی، میں چلا۔“

پتا نہیں کیوں اس سے مجھے لگا تھا جیسے ماما مجھ سے میرے باپ کے متعلق سچ چھپا نا چاہتی ہے۔ شاید وہ زندہ ہیں اور ماما نہیں چاہتی کہ مجھے اس کا علم ہو۔ بہر حال میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ایک روز اس کا بھی کھوج لگا لوں گی۔ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو مجھے علم ہو ہی جائے گا اور جب اس بات کا اظہار میں نے حسان سے کیا تو حسان نے بھی اس کی تائید کی تھی اور کہا تھا۔

”لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ سومی اس کا انہیں کیا فائدہ ہوگا۔“

”شاید انہوں نے میری پیدائش کی خبر میرے ابو سے چھپائی ہو یا یہ بتایا ہو کہ

میں بھی ماں کے ساتھ مر گئی ہوں۔“

میں نے خیال ظاہر کیا تھا میرا ذہن بہت تیزی سے کام رہا تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ ماموں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ

انہوں نے کچھ رقم لے کر۔۔۔“

میں شرمندہ ہو گئی۔ اپنا آپ کتنا گھٹیا اور کم تر لگتا تھا اس خیال سے لیکن میں حسان

سے کچھ چھپا نہیں سکتی تھی۔ یہ حسان ہی تھا جو تب سے اب تک میرے ساتھ ساتھ تھا۔ یہ

باتیں کرنے کے لیے صرف اپنے ہونے والے سسرال اور منگیتر کا موضوع تھا۔ عاصمہ مجھ سے خاصی مرعوب تھی اور اکثر مجھ سے لیسٹ فیشن اور نئے رجحانات کے متعلق پوچھتی رہتی تھی۔ گو اس نے ٹھنڈ ڈویژن میں انٹر کیا تھا لیکن خود کو بڑی شے سمجھتی تھی اور ماما بھی اسے اپنا مشیر سمجھتی تھی۔ اسے ہر وقت پیسے کمانے کے نئے نئے طریقے سوچتے تھے جو بوس اور بیکار ہوتے تھے اور وہ اچانک دولت مل جانے کے خواب دیکھتی رہتی تھی اس مقصد کے لیے اس نے دو تین ہانڈ بھی خرید رکھے تھے۔ تینوں لڑکوں سے کم ہی ملاقات ہوتی تھی نوید تو سارا دن دکان پر ہوتا تھا جبکہ سعید اپنی نوکری پر اور وحید کبھی کبھار ہی گھر پر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نوے جماعت میں پڑھائی چھوڑ دی تھی وہ کیا کرتا تھا اتنے دنوں میں مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ نہ تو وہ دکان پر جاتا تھا اور نہ ہی زیادہ گھر پر ہوتا تھا اور وہ بہت تنقیدی اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتا تھا اور مجھے بہت الجھن ہوتی تھی۔ میں اپنی امی اور ابو کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی لیکن مجھے ان کے متعلق بہت کم بتایا جاتا تھا۔ ایک بار ماموں سے اپنے ابو کے متعلق پوچھا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ اس روز وحید بھی وہاں موجود تھا بات وحید نے شروع کی تھی۔

”عارفہ پھپھو مجھے ابھی تک یاد ہیں تب سات آٹھ سال کا تو تھا، کیوں ابا؟“

”ہاں ہاں!“

ماموں کے بجائے ماما نے جواب دیا تھا۔

”یاد کیوں نہ ہو عارفہ کی تو جان اٹکی ہوئی تھی تم میں۔ ہمیشہ مجھ سے کہتی بھابھی

وحید میرا بیٹا ہے۔“

”اور میرے ابو، ماموں وہ کہاں ہیں کیا وہ بھی۔۔۔؟“

میں نے پہلی بار اپنے باپ کے متعلق پوچھا تھا۔ میں اب نارل ہو رہی تھی اور

ہر بات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں دو تین بار اس کا خیال تو

آیا تھا لیکن میں نے پوچھا نہیں تھا یا شاید پوچھا بھی تھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا

میرے دل میں جیسے کانٹا سا چبھا تھا۔

”ہاں میں گیا تھا۔“

”اور میرے متعلق اس نے پوچھا تھا؟ تم نے بتایا؟“

”وہ گئی تھی تمہارے گھر دعوت دینے۔“

”پھر؟“

کیسا باریک میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے دنوں میں پہلی بار میں نے اس

گھر اور اس گھر سے وابستہ افراد کو شدت سے یاد کیا۔

”رومی، ریان، پاپا، بیسا سب ٹھیک تو تھے نا۔“

”شاید۔“

حسان کا لہجہ پست ہو گیا۔

”وہ سب بہت بہت اپ سیٹ تھے بہت پریشان تھے۔ رومی اور ریان تو بہت ہی

افردہ اور دکھی تھے اور رومی تو بہت کمزور ہو گئی ہے بہت روتی ہے۔“

میرے آنسو میرے اندر گرنے لگے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ میں نے

زندگی کے چوبیس سال گزارے تھے۔ جن کے ایک آنسو پر میں تڑپ اٹھتی تھی اور میں نے

ان سب کو ایک بار بھی یاد نہیں کیا تھا کیا میں خود غرض تھی۔

”ان سب کا تو کوئی قصور نہیں تھا سومی، انہوں نے تم سے ہمیشہ محبت کی تمہاری

کبھی حق تلفی نہیں کی، ہر خوشی اور سہولت تمہیں دی۔ اگر تم ان کی اپنی سگی بیٹی نہیں تھی پھر بھی

انہوں نے تمہیں پالا پوسا جوان کیا تمہیں۔“

میری پلکوں پر جانے کہاں سے موتیوں کے قطرے آکر ٹھہر گئے تھے۔ تو حسان

بات کرتے کرتے خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

”سومی تمہارے پاپا بہت بہت اپ سیٹ تھے بہت پریشان تھے۔ ایک روز میں ڈاکٹر

لنچر سے ملنے مینٹل ہاسپٹل گیا تھا وہاں آئے ہوئے تھے شاید تمہاری ہی کھوج میں آئے

جان کر بھی کہ میں ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اس کے رویے میں کوئی فرق

نہیں پڑا تھا۔

”ہو سکتا ہے تمہارا خیال صحیح ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے تمہاری مامی صحیح کہہ رہی ہوں

اور تمہیں یوں ہی وہم ہوا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے ابو نے تمہاری امی کو چھوڑ دیا ہو تم نے

بتایا تھا کہ تمہاری امی کوئی بی بی تھا۔“

”ہے۔ بی۔“ (may be)

میں نے حسان کی طرف دیکھا تھا اور چونکی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور

لگ رہا تھا اور میں کتنی خود غرض تھی کہ میں نے ان دو ماہ میں ایک بار بھی اس سے اس کے

متعلق نہیں پوچھا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ کیا وہ اپنے والدین کے گھر چلا گیا ہے یا

نہیں۔ ابھی ہوسٹل میں ہی رہ رہا ہے اسے کوئی جاب وغیرہ بھی ملی ہے یا نہیں۔

”حسان! تم کہاں ہو آج کل اور فراز نا، سید وغیرہ کسی سے ملاقات ہوئی ہے

یا نہیں۔“

”تھینک گاڈ!“

حسان نے اوپر سر اٹھا کر شکر یہ ادا کیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تھینک گاڈ سومی! تم نے اپنے گرد سوچنا شروع کیا۔ میں وہاں ہی ہاسٹل میں اور

میں نے ایک ڈگری کالج میں لیکچرار کی جاب کرنی ہے۔“

”اور تمہارا ہاسپٹل، جینی مریضوں کا علاج۔۔۔؟“

”سب چلتا ہے یا رہ ضروری نہیں کہ انسان جو سوچتا ہو وہ پورا بھی ہو۔“

”فراز اور نا سید کا تم نے نہیں بتایا۔“

”فراز تو امریکہ چلا گیا ہے اور نا سید کی شادی ہو گئی ہے۔ فی الحال سرال میں

ہے جلد ہی وہ بھی سعودیہ کی طرف پرواز کر جائے گی۔“

”تم گئے تھے اس کی شادی میں؟“

تھے۔ اگر مجھے تمہاری ناراضگی کا خیال نہ ہوتا تو میں کم از کم تمہاری خیریت کی اطلاع ضرور دیتا۔“

میرے آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ یکدم کسی بڑے نقصان کا احساس ہوا تھا۔

”تم ایک فون تو کر سکتی ہو روی کو۔“

لیکن میں خاموش ہی رہی تھی جو ہو چکا تھا اسے وقت کے صفحات سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ جب میں نے شہر محبت سے باہر قدم رکھا تھا تو اپنے پیچھے اس کے دروازے بند کر دیے تھے۔ واپس پلٹنے کی گنجائش تھی نہ راستہ اگر میں کوئی گنجائش نکال لیتی تو کیا وہاں اب میرے اس عمل کے بعد کوئی مجھے Accept کر سکتا تھا شاید بلکہ یقیناً نہیں۔ مگر تو شاید زندگی بھر میری شکل بھی نہ دیکھیں وہ جو اپنے حلقہ احباب میں فخر سے سراٹھا کر چلتی تھیں میرے اس طرح گھر سے چلے آنے کے بعد وہ اسی فخر سے سراٹھا کر جی سکیں گی۔ لوگ تو نہیں جانتے تھے کہ میں ان کی سنگی بیٹی نہیں ہوں اور اب اگر وہ بتائیں بھی تو بھلا کون یقین کرے گا ان کی بات پر سب ہی کہیں گے کہ بدنامی سے بچنے کے لیے انہوں نے جھوٹ گھڑا ہے۔

کتنی بڑی غلطی ہوئی تھی مجھ سے، ایسی غلطی جس کا کوئی مددگار نہیں تھا دکھ اور پچھتاوے سے میری آنکھیں برسنے لگیں۔

”کیا ہوا سمیعہ! کیوں رو رہی ہو؟“

حسان ہمیشہ کی طرح گھبرا گیا۔

”حسان مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ کتنی خود غرض ہوں میں، ہیں نام میں نے

میرے اپنے متعلق سوچا ان سب کا خیال نہیں کیا۔“

میری چپکلیاں بند گئیں۔

”ٹھیک اسٹا ایزی سمیعہ! میں تمہیں لے چلا ہوں واپس۔“

”نہیں پلیز“

میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”اب تو وہ مٹی ڈال چکے ہوں گے مجھ پر!“

”خونی رشتے بے شک بہت پائیدار ہوتے ہیں لیکن محبتوں کے رشتے بھی کمزور

نہیں ہوتے اور کبھی کبھی تو خون کے رشتوں سے بھی زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔“

”نہیں حسان مجھے اب واپس نہیں جانا۔ اس شرمندگی کے ساتھ میں اب ان سے

نظریں نہیں ملا سکیں گی۔“

حسان نے پھر اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ میں اس روز بہت روئی تھی۔

”مدحت کامیاب اس ہفتے دوہی جا رہا ہے ایک ہفتے کے لیے۔ میرے ساتھ چلنا

مدحت کی طرف Change آجائے گا۔ جب سے آئی ہو یہاں ہی بند ہو۔“

حسان نے میرے آنسو پونچھے تھے۔ الٹی سیدھی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کی

تھی اور جب میں نارمل ہوئی تو کہا۔

”میں ماموں کی طرف تو جاتی ہوں۔“

”خیر وہ تو ہے لیکن مدحت بھی کہہ رہی تھی کہ لانا کسی روز سمیعہ کو۔“

”ٹھیک ہے دیکھوں گی اگر موڈ بناتا تو!“

حسان چلا گیا تو میرے دل پر دھرا بوجھ اور بڑھ گیا۔ اس رات میں دیر تک جاگتی

رہی میرے آنسو میرا کیجی بھگوتے رہے۔ اس رات میں نے اتنے دنوں بعد فیضان کو بھی یاد

کیا۔ وہ شخص جس نے مجھے محبت کے جذبے سے آشنائی دی تھی اور میری جھولی میں محبتوں

کے پھول ڈالے تھے لیکن جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے احساس ہوا میں اس سے اس

طرح کی محبت نہیں کرتی تھی کہ اس کی محبت میری زندگی کا روگ بن جاتی۔ یہ انسانی فطرت

تھی میں نے بہت ایمان داری سے اپنا تجزیہ کیا۔ میں عمر کے اس دور میں تھی جب دل کے

نہاں خانوں میں کسی کی رفاقت کا احساس کسی کی محبت کو پالینے کی چاہ چھپی ہوتی ہے اور اس

دور میں جو بھی پہلا شخص محبتوں کا اظہار کرتا ہے وہی دل کو اچھا لگنے لگتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی محبت دل میں جگہ بناتی چلی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ بے شک میں خود کو دوسروں سے منفرد سمجھتی تھی لیکن اندر سے بھی تو ایک لڑکی نایک عام معمولی سی لڑکی مرد کی محبت اور رفاقت کی تمنی۔ فیضان نے مجھے سراہا مجھے اپنی محبت سے سرفراز کیا تو میں نے بھی اپنے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا اور اگر مجھ سے کہیں انہوں نے رومی کے لیے فیضان کو سوچ رکھا ہے تو کیا میں رومی کی خاطر پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی ہاں مجھے دکھ ضرور ہوتا میں ضرور یہ سوچتی کہ ماما میرے مقابلے میں رومی سے زیادہ محبت کر رہے ہیں لیکن بالآخر میں اسے Accept کر لیتی کہ رومی بھی تو میری جان ہے لیکن ماما تکلیف دہ انکشاف نہ کر میں تو میں ساری زندگی اس خوش فہمی میں ہی گزار دیتی کہ میں ان کی ہی بیٹی ہوں۔ میرا تعلق کس خاندان سے تھا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مجھے۔ غربت کوئی گناہ نہیں ہے کوئی تذلیل نہیں ہے، ذلت کی بات تو یہ تھی کہ میرے عوض پاپا سے روپے لیے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ ایک روز سعید نے باتوں باتوں میں اس کی تصدیق کر دی تھی کہ فصیح احمد صاحب نے تین لاکھ روپے دیئے تھے دادا کو یہاں قصور میں جگہ خریدنے اور گھر بنانے کے لیے۔ وہ اس وقت وحید کے خلاف بول رہا تھا۔

”یہ چھوٹا سا گھر ڈیڑھ لاکھ میں مل گیا تھا۔ پچاس ساٹھ ہزار کا مال دکان میں ڈال لیا گیا تھا اور ایک لاکھ کے ابانے سیونگ سرٹیفکیٹ لے لیے تھے۔ دس سال بعد چار لاکھ ہو گئے تھے، ابانے پھر چار لاکھ کے سرٹیفکیٹ لے لیے تھے۔ ابا کا پروگرام تھا اگلے دس سال میں سولہ ستر لاکھ روپے ہو جائیں گے تو ذرا بہتر گھر خرید کر ایک بڑا اسٹور بنالیں گے جس میں تینوں بھائی مل کر کام کریں گے۔ یہ جو ہے وحید، اسے جوئے کی لت لگ گئی اور چپکے چپکے اس نے اندر سے سرٹیفکیٹ نکال کر رقم حاصل کر لی، اسی کے نام سے ابانے سارے سرٹیفکیٹ لے رکھے تھے نا اسی کے دستخط تھے ابا تو بڑھا لکھا نہیں تھا۔“

”اور پتا ہے سمیعہ! یہ ساری رقم اس نے جوئے میں ہار دی اور جب ابا کو پتا چلا تو ماں اور ابا بہت روئے پیئے۔ تین دن تک ہمارے گھر میں رونا پیٹنا ہوتا رہا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ شکر ہے سر چھپانے کا ٹھکانہ تھا دکان سے اتنا روپیہ لے جاتا ہے کہ گزارا ہو جاتا ہے۔“

سعید تینوں بھائیوں میں سے سب سے بہتر لگا تھا مجھے۔ لیکن اس روز میں بہت افسردہ تھی اور دن میں کوئی دس دفعہ میں نے سوچا تھا کہ مجھے ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے جنہوں نے پیسے کے عوض مجھے دے دیا تھا۔ لیکن پھر میں نے انہیں غربت اور ضرورت کا مارجن دے کر معاف کر دیا۔ میں انہیں چھوڑ نہیں سکتی تھی یہ میرا واحد خونی رشتہ تھا۔ میری ماں کا بھائی اور یہ انسانی فطرت ہے کہ انصاف کے پلڑے میں جب ایک طرف اپنے ہوں اور دوسری طرف غیر تو پلڑا اپنوں کی طرف جھکتا ہے اور میں نے بھی انہیں ایک اور مارجن بھی دے دیا تھا۔ اگر یہ لوگ مجھے فصیح احمد کے حوالے نہ کرتے تو میں بھی نسرین یا عاصمہ جیسی ہوتی یا شاید ان سے بھی بدتر۔ میں نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی زندگی کی ہر سہولت سے فیض یاب ہوئی تھی اور اگر شبیر ماموں کے پاس رہتی تو شاید نسرین کی طرح ہونے والے سسرال کی برائیاں کرتی رہتی یا پھر عاصمہ کی طرح نت نئے فیشن اور تیز رنگوں کی لپ اسٹک لگا کر اتراتی پھرتی۔ میں نے ان کو تو مارجن دے کر معاف کر دیا تھا لیکن اس روز بھی میں نے ان لوگوں کے بارے میں دل میں کہیں کوئی نرمی محسوس نہیں کی تھی جنہوں نے مجھے بہت کچھ دیا تھا، بہتر اور شاندار زندگی۔ پتا نہیں کیوں میں اتنی خود غرض تھی لیکن آج میں ان کے متعلق سوچ رہی تھی انہیں یاد کر رہی تھی۔ میں نے تین دفعہ رومی کا نمبر ملا کر آف کر دیا، دوبار گھر کے نمبر ملائے اور پھر ایک بیل کے بعد فون بند کر دیا۔ نہیں اب مجھے کیا حق بنتا ہے ان سب سے تعلق جوڑنے کا جن کے متعلق اس گھر سے آتے ہوئے میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ جب سے میں ”شہر محبت“ سے آئی تھی اپنی ہی بے بسی کا ماتم کرتی رہتی تھی، یہ پہلی رات تھی جب میں ان کی جدائی میں جاگ رہی تھی۔ جب فجر کی

اذان ہو رہی تھی تو میں اپنے بیڈ پر بیٹھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ریان تو اب مجھ سے ہر بات شیر کر کے لگا تھا وہ اب کس سے اپنی باتیں شیر کرتا ہوگا اور روی وہ تو اتنی معصوم ہے کہ اگر ناظرہ شیرازی جیسی خاتون اسے ٹکرائے گی۔ بیا کا بلڈ پریشر اچانک ہائی ہو جاتا ہے کبھی کبھی اور ماما کو تو اسلام آباد جانا ہوتا ہے کون سب کا خیال رکھتا ہوگا۔ یہ میں نے کیا کیا، کیوں کیا۔ جب تک ناشتے کی کھنٹی نہ بجی میں یونہی روتی رہی حتیٰ کہ باہر برآمدے میں لڑکیوں کی باتیں کرنے چلنے اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب ڈانٹنگ روم کی طرف جا رہی تھیں اپنا اپنا ناشتہ لیے۔ میں بوجھل سر سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی بہت دیر تک گرم پانی سے غسل کرنے کے باوجود سراسی طرح بوجھل تھا اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ ہوشل کی ہیڈ گرل جب مائی کے ساتھ ناشتے کی ٹرے لائی تو چوکی۔

”میڈم آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“

”ہاں کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے“

”میڈم آپ چھٹی لے کر گھر چلی جائیں۔“

”چند دنوں تک دسمبر کی چھٹیاں ہونے والی ہیں پھر چلی جاؤں گی۔“ اسے تو

میں نے کہہ دیا تھا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں چلوگی لیکن کہاں جاؤ گی ایک بڑا سا سوالیہ نشان میرے اندر بنا اور پھر میں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ میں چھٹیاں شبیر ماموں کے گھر ہی گزاروں گی۔ بہر حال اب وہی میرے سب کچھ تھے اور میں انہیں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں نے ملک فصیح احمد کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے، ابھی تک میں نے نہیں بتایا تھا۔ حسان میرا فیصلہ سن کر حیران ہوا۔

”لیکن سمیعہ! میں نے مدحت سے کہا ہے کہ تم چھٹیوں میں اس کے پاس آ کر

رہو گی۔“

”لیکن میں نے تو تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔“ میں نے حیرت سے اسے

دیکھا۔

”ہاں لیکن میں نے۔۔۔“ وہ سر کھانے لگا۔

”جتنا ہے مدحت کا پروگرام بن رہا تھا وہی جانے کا لیکن میں نے منع کیا تھا اسے

اور تم جانتی ہو نا وہ بہت کیوٹ ہے، اس نے میری بات مان لی ہے۔“

”تم اب اس سے کہہ دو وہ چلی جائے۔“

”اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ پہلے انتظام کرنا ہوتا ہے میڈسن بنانے والی کمپنی آرٹج

کرتی ہے نا یہ ٹور اور اب تو کل کی فلائٹ سے رمیز بھائی جا رہے ہیں۔“

”لیکن میں نے شبیر ماموں کی فیملی سے بھی وعدہ کر لیا ہے کہ میں چھٹیاں ان کے

پاس گزاروں گی۔“

حالانکہ میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

”ان کی طرف تو جاتی ہی رہتی ہو۔“

”ہاں لیکن یہ بھی سوچو حسان! میں نے ایک عمران سے دور گزاری ہے۔ ٹھیک

ہے پپانے مجھے اڈاپٹ کر لیا تھا لیکن انہیں ان لوگوں کو مجھ سے ملنے سے تو نہیں روکنا چاہیے

تھانا۔“

حسان ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”او کے اگر کبھی تمہارا دل نہ لگے ادھر، تو مجھے فون کر دینا۔“

بھلا دل نہ لگنے کی کیا وجہ تھی آخر وہ میرے اپنے تھے میں نے سوچا تھا۔ حسان نے

جاتے جاتے مجھے مڑ کر دیکھا تھا۔

”اب شاید چھٹیوں کے بعد چکر لگاؤں یا شاید نہ لگاؤں۔ یوں بھی تمہیں تمہارے

اپنے مل گئے ہیں اور تمہیں اب میری ضرورت بھی نہیں۔“

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کالج ہوشل کے گیٹ سے باہر نکل گیا میں وہیں ساکت

کھڑی رہ گئی۔ مجھے لگا جیسے میں یکدم اکیلی اور تنہا ہو گئی ہوں جیسے میری کوئی قیمتی متاز

سے چھین گئی ہو۔

میں اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی اسے پکارنا چاہتی تھی لیکن میرے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اور زبان اکڑ گئی تھی۔ میرے منہ سے پھنی پھنی سی آواز نکلی تھی لیکن حسان گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔ میں سارا وقت کھوئی کھوئی سی ہوشل کے برآمدوں اور کمروں میں چکراتی رہی اور پھر یہاں تک کہ آخری لڑکی بھی چلی گئی تھی تو میں بیک میں چند جوازے کپڑے ڈال کر شبیر ماموں کے گھر چلی گئی۔ میرے ہاتھ میں بیک دیکھ کر صحن میں بیٹھی سبزی کافی مای کی آنکھوں میں حسرت نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”آؤ آؤ بیٹی بڑی لمبی عمر ہے تمہاری ابھی میں تمہاری ہی باتیں کر رہی تھی وحید پتر سے۔“

ایسا پر جوش استقبال مای نے کبھی نہیں کیا تھا۔ بیک زمین پر رکھ کر میں صحن میں پھنی چارپائی پر بیٹھ گئی اور لہجے میں بشارت پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”کالج میں بارہ پھنیاں ہو گئی ہیں، میں نے سوچا چار دن اپنے ماموں کے گھر گزار لوں۔“

”ارے چار دن کیوں ساری پھنیاں ادھر ہی رہو گی، میں نہیں جانے دوں گی۔ ساری زندگی ادھر ہی رہی ہو۔ کیا ہمارا حق نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں مای۔“

میں خواہ مخواہ ہنس دی۔ ذہن سے ایک بوجھ اتارتا تھا کہ میں کہاں رہوں گی۔ اگر مای کو میرا آنا اچھا نہ لگتا تو۔۔

”حق کیوں نہیں ہے آپ کا۔“

”تو بس میں نے کہہ دیا ہے یہ پھنیاں تم نے نہیں جانا۔“

”وحید! ارے کہاں چلا گیا دیکھ کون آیا ہے؟“

وہ وحید کو آواز دینے لگیں اتنے میں عاصمہ کمرے نکل آئی اور ابھی وہ میرے

پاس چارپائی پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ وحید کمرے سے نکل کر آیا۔ بالوں کو تیل لگا کر اچھی طرح سر جھائے وہ کہیں جا رہا تھا شاید۔

”سنو! اماں کہہ رہی ہیں چھٹیوں میں ادھر ہی رہو گی۔ ہمارے گھر؟“

نہ سلام نہ کوئی اور بات بالکل میرے قریب کھڑے ہو کر اس نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کسی گھٹیا سینٹ کی خوشبو نے میرے سر کو بوجھل کر دیا تھا۔

”اماں کچھ پیسے ہیں تو دے دو رات میں واپس کر دوں گا۔“

”لو میرے پاس تو کھوئی کوڑی نہیں ہے۔ تیرے ابا نے صبح سو روپے دیے تھے سب خرچ ہو گئے سبزی وغیرہ لانے میں۔“

”جھوٹ مت بولو اماں مجھے پتا ہے یہ سبزی جو تو لاتی ہے کتنے کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیس روپے کی ہے۔ کہا تو رات کو دے دوں گا۔“

”کہہ تو دیا کہ نہیں ہیں میرے پاس۔“

مای کا موڈ خراب ہو رہا تھا حالانکہ وہ وحید کے ساتھ خوب ہنستی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔ مجھے یہ بھرا کر اچھی نہیں لگ رہی تھی، میرے پاس خاصی رقم تھی۔ دو ماہ کی تنخواہ کے علاوہ میں گھر سے آتے ہوئے اپنے پاس موجود ساری رقم لے آئی تھی۔ میں نے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر وحید کو دے دیا۔

”یہ لے لیں۔“

”اوئے!“

اس نے جھپٹ کر نوٹ مجھ سے لے لیا اور اسے چوتے ہوئے ایک فلائنگ کس میری طرف اچھالا، میں سرخ پڑ گئی۔

یہ لوگ اور کچھ سیکیں یا نہ سیکیں فلمیں اور بے ہودہ انڈین ڈرامے دیکھ دیکھ کر یہ سب ضرور سیکھ جاتے ہیں۔ ایک بار نائید نے کہا تھا۔

وحید جا چکا تھا اور مای ہکا بکاسی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

”لے لو اور پورے ہزار تھما دیے، ابھی گھنٹوں میں پارکر کے آجائے گا بہت کھانا ہاتھ ہے میرے وحید کا، بالکل اپنی پھوپھو عارفہ کی طرح اور عارفہ تو جان دیتی تھی وحید پر۔“

کئی بار کا کہا ہوا جملہ اب وہ پھر دہرا رہی تھی پتا ہے مجھ سے اکثر کہتی تھی اگر میری بیٹی ہوئی تا بھابھی تو پھر میں وحید کو ہی اپنا داماد بناؤں گی لیکن ہماری بد نصیبی فصیح احمد صاحب تمہیں لے گئے اور اب کہاں وحید کہاں تم، وہ بات کرتے ہوئے کن اکھیوں سے مجھے بھی دیکھتی جا رہی تھی شاید میرے احساسات کا اندازہ لگانا چاہتی لیکن مجھے تو وحید کے ساتھ کے تصور سے ہی ہنسی آگئی بھلا کہاں وحید اور کہاں میں۔

”اے عاصمہ یہاں دھرتا مار کر بیٹھ گئی ہے بہن کب سے آئی ہوئی ہے۔ دکان سے دوڑ کر اباسے پیسے پکڑ لا اور کسی بچے کو پڑوس سے بھیج کر دودھ منگوالے۔“

لیکن عاصمہ یونہی بیٹھی مجھے ریماکے کسی ڈریس کے متعلق بتا رہی تھی جو رات کسی ٹی وی شو میں اس نے پہن رکھا تھا آخر اسے ڈانٹتی ڈانٹتی ہوئی خود اٹھیں۔

”ارے بیٹی تیرے پاس دس روپے ہیں تو دے دو رات کو تیرے ماموں آئیں گے تو لے لیتا۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں ماما، میں کوئی غیر ہوں۔“

میں نے پرس کھولا میرے پاس اتفاق سے change نہیں تھا ہزار اور پانچ سو کے نوٹ تھے ایک پانچ سو کا نوٹ ماما کو پکڑا دیا۔

”ماما change نہیں ہے۔“

لیکن یہ ابتدا تھی اگلے چند روز میں ماما اور وحید مختلف حیلے بہانوں سے مجھ سے سات آٹھ ہزار روپے لے چکے تھے۔

وحید کا تو وہی انداز تھا۔ ”سمیہ کچھ روپے ادھار دے دو رات کو لٹاؤں گا۔“

اور ماما کا وہی پرانا انداز مختلف اخراجات کا روٹا دھونا اور مجھے لگتا کہ میرے پاس روپے ہیں تو مجھے ان کی ضرورت پوری کرنا چاہیے۔ مجھے ماموں کے گھر آئے ساتواں دن

تھا جب میں نے سوچا اس سارے عرصہ میں حسان نے نہ کوئی میسج کیا نہ فون تو کیا میں نے حسان کو بھی کھو دیا ہے اور اس احساس نے میرے اندر ماتم پیدا کر دیا میرا دل بے آواز دروہا تھا بالآخر ایک دن تو اسے جانا ہی تھا میرے اور اس کے درمیان ایسا کیا تھا جو میں اسے روک سکتی تھی اس نے انسانیت کے ناطے اتنا کچھ کیا تھا اور میرا خیال رکھا تھا یہ بہت تھا اور اس کی ایک فطرت تھی کہ وہ ہر ایک کے کام آتا تھا ورنہ۔۔۔ اور کیا واقعی میرے اور اس کے درمیان کچھ نہیں تھا میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں صرف اس لیے اسے مس کر رہی ہوں کہ میرے ساتھ ہمدردی کرتا تھا اور اس نے میرا خیال کسی اپنے کی طرح رکھا۔ نہیں کچھ تو تھا دوستی یا شاید محبت۔

میں یکدم چونکی کیا میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں اور مجھے اپنے دل کے ایک کونے میں اس کا نام جگمگانا ہوا دکھائی دیا یہ ایک اور رتجگا تھا لیکن اس رتجگے میں آگئی کا کرب تھا محبت کا سوز تھا اور کھوجانے کا دکھ۔ اگلی صبح مجھے بہت روشن اور خوبصورت لگی تھی برآمدے میں بیٹھی میں دھوپ کو انجوائے کر رہی تھی جب عاصمہ ہاتھ میں ایک تصویر اٹھائے اپنے کمرے سے باہر نکلی گھر میں میرے اور عاصمہ کے سوا کوئی نہیں تھا صبح ناشتے کے بعد ماما، وحید، ماموں اور نسرین کسی رشتہ دار کے ہاں اچانک ہو جانے والی موت پر چلے گئے تھے مرید کے اور نوید دکان پر تھا۔

”یہ دیکھو عارفہ پھوپھو کی شادی کی تصویر، میں اب کی الماری صاف کر رہی تھی کہ اخبار کے نیچے سے ملی ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہاری تصویر ہو۔“ عاصمہ نے کہا

میں نے بے حد اشتیاق سے تصویر پکڑ لی اور پھر ساکت ہو گئی میری نظریں تصویر پر تھیں اور دل جیسے لمحہ بھر کے لیے بند ہو گیا تھا۔

”جہاں تا عارفہ پھوپھو بالکل تمہاری کاپی۔“

لیکن میں اماں کو کب دیکھ رہی تھی میں سرخ لباس میں ملبوس اس دہلی پتلی اپنی معمول لڑکی کو دیکھنے کے بجائے اس کے ساتھ کھڑے اس شخص کے دیکھ رہی تھی جو بلیک ڈنر

سوٹ میں بے حد باوقار اور شاعرانہ لگ رہا تھا۔

”چپا!“ میرے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا اور پھر میرے آنسو خساروں پر بہہ آئے تھے۔

”اوشاید تمہیں اپنی اماں کی یاد آ رہی ہے۔“

عاصمہ میرے رونے پر بے زاری کھڑی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”تصویر مجھے واپس کر دینا ابانے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے بہت پیار تھا انہیں

اپنی بہن سے۔“

مامی اور ماموں نے کیوں چھپایا، انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟ میری امی کی شادی پیا نصیح احمد سے ہوئی تھی یہ بات کیوں نہیں بتائی مجھے۔ میں نے کتنی ہی بار دونوں کی تصویروں کو دیکھا امی اگرچہ کچھ دہلی پتلی اور کمزوری تھیں لیکن ان کی آنکھیں ان کے ہونٹ ناک پیشانی سب میرے جیسی ہی تھی اور پیا سنجیدہ اور باوقار سے کتنے گریس فل لگ رہے تھے میرا جی چاہا کہ میں ابھی بھاگتی ہوئی جاؤں اور ان کے قدموں پر گر کر معافی مانگ لوں وہ سب کچھ دیر پہلے میرے کوئی نہیں تھے اب ان سے سب سے میرا رشتہ جڑ گیا تھا ایک تعلق تھا بھلے سے ماسو تیلی تھیں لیکن وہ سب تو اپنے تھے تا لیکن اب میرا دل ڈوبنے لگا میں نے اپنے شہر محبت کو خود چھوڑا تھا میں دھوپ ڈھلنے تک وہیں برآمدے میں بیٹھی رہی عاصمہ مجھ سے تصویر لے گئی تھی حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ تصویر مجھے دے دو لیکن جواباً اس نے کندھے اچکا دیئے تھے

”ابا سے مانگ لینا۔“

ایک بار نوید بھی دکان سے امدار آیا تھا اور مجھ سے حال چال پوچھ کر باورچی خانے میں گھس گیا تھا عاصمہ نے اسے کھانا دیا تھا اور خود روٹی پکا کر میرے پاس آ کر کھانے لگی میرے امدار کھانے کی طلب نہ تھی حالانکہ عاصمہ نے دوبارہ مجھ پوچھا تھا۔

”رات کی وال پڑی ہے اور اگر وال نہیں کھانا تو میری طرح اچار سے کھالو۔“

لیکن نفی میں سر ہلادیا تھا میں تو یہ کتنی سلجھا نہیں پا رہی تھی کہ چپانے ایک غریب لڑکی سے شادی کیوں کی اور پھر ماموں مامی نے یہ بات مجھ سے چھپائی کیوں، کیا اس طرح کر کے وہ کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن کیا، یہ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا میں نے سوچا کہ میں حسان کو فون کروں لیکن حسان کا سیل آف تھا۔ عاصمہ کھانا کھا کر پھر اندر چلی گئی اور میں اسی طرح بیٹھی تھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ایک بار پھر تصویر دیکھوں۔ آخر کار اٹھ کر میں اس کے پیچھے کمرے میں آئی وہ ماموں کی چارپائی پر بیٹھی دس دس کے نوٹ گن رہی تھی مجھے دیکھ کر چونکی اور روپے مٹھی میں بند کر لیے۔

”پلیز وہ تصویر مجھے دے دو۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ میری امی کی تصویر ہے میں نے زندگی بھر انہیں نہیں دیکھا اب اس تصویر کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں پلیز میری بہن دے دو۔“ میں جانتی تھی ماموں یہ تصویر مجھے نہیں دیں گے ان کا راز کھل جاتا۔

”ہا ہے یہ تصویر الماری میں کپڑوں کے نیچے پڑے اخبار کے نیچے بالکل پیچھے کونے میں پڑی تھی اور میں اماں کی بچت ڈھونڈ رہی تھی تو لگتی اتنی محنت کا فائدہ بھی کوئی نہ ہوا صرف ایک سو اسی روپے ملے ہیں۔“ اس نے مٹھی کھول دی۔

”جبکہ میں نے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان پر جو سوٹ دیکھا تھا وہ دو ہزار روپے کا تھا۔“

”اچھی بہن میں تمہیں دو ہزار روپے کی یہ تصویر مجھے دے دو۔“

”اچھا لیکن اماں ابا کو نہ پتا چلے۔“

”نہیں بتاؤں گی۔“

اور تصویر لے کر میں نے اسے دو ہزار روپے دے دیے تھے میں نہیں جانتی کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے اور مجھے کیا کرنا ہے یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے

”آرام سے کھاؤ نا، کباب دیکھتے ہی تم تو پاگل ہو جاتی ہو۔ یہ آلو کی بھاجی بھی ہے۔“ عاصمہ نے اس کے ہاتھ سے دوسرا کباب لے لیا۔ پلیٹ میں صرف تین کباب ہی تھے۔

”یہ چکھو نا سمعیہ، بہت مزے کا ہے۔“

”نہیں پلیز عاصمہ نہیں!“

”چائے بنا دوں؟“

”ہاں اگر تکلیف نہ ہو تو!“

”واؤ!“

نسرین دسترخوان سے ہاتھ پونچھتی اور آنکھیں میکا میکا کر عاصمہ کو دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی جب دوبارہ نسرین کمرے میں آئی تو میں چائے پی چکی تھی نسرین نے آتے ہی یہ کہہ کر لائٹ آف کر دی کہ ”مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔“

میں نے خاموشی سے کروٹ بدل کر لحاف کے اندر منہ کر لیا عاصمہ نے آکر کمرے کی لائٹ جلائی تھی پھر ہم دونوں کو سوتا دیکھ کر لائٹ آف کر کے وہ بھی سو گئی۔ ٹی وی بیٹھک میں تھا جہاں تینوں بھائی سوئے تھے اور عموماً عاصمہ، نسرین دیر تک اس کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہتی تھیں لیکن آج کل ٹی وی خراب تھا لہذا وہ جلد سو جاتی تھیں۔ ماموں روز وعدہ کر جاتے کہ وہ آج ٹی وی ٹھیک کرانے لے جائیں گے لیکن انہیں وقت نہیں مل رہا تھا وہ دونوں تو جلد ہی سو گئیں لیکن میری آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی ساری زندگی کی فلم میری آنکھوں میں چل رہی رات کا جانے کونسا پہر تھا جب میں پانی پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تھی ماموں کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹھک کر رک گئی۔

”میں کہتی ہوں وحید کے ابا کب بات کرے؟“ یہ مامی کی آواز تھی۔

”آہستہ بولو۔“ ماموں نے اسے تنبیہ کی لیکن مامی شاید آہستہ بول ہی نہیں سکتی

تھیں۔

والا ہے میں کچھ جج نہیں کر پار ہی تھی۔ میرے اندر سے آواز اٹھ رہی تھی کہ مجھے واپس چلے جانا چاہیے وہ مجھے معاف کر دیں گے ضرور، مہمہ معاف نہ بھی کریں تو پیا ضرور معاف کر دیں گے لیکن کوئی احساس شرمندگی مجھے روکتا بھی تھا۔ نہیں اب نہیں۔ رات کو سب لوگ واپس آگئے تھے میں کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ نسرین، عاصمہ اور میں ایک کمرے میں سوئے تھے جبکہ تینوں بھائیوں کا ایک کمرہ تھا ہمارے کمرے کے بالکل ساتھ ماموں اور مامی کا کمرہ تھا۔ نسرین آتے ہی اپنی چار پائی پر ڈھکے گئی تھی۔

”اف او میں تو تھک گئی ہوں۔“

عاصمہ رات کا کھانا ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی شاید یہ ان دو ہزار روپوں کا اثر تھا اس نے آلو کی بھیجیا بنائی تھا اور ساتھ میں کچھ کباب تھے۔ ”وحید لایا، اٹھو تم بھی کھا لو۔“ اس نے چار پائی پر ٹرے رکھا۔ نسرین فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”میں سمیعہ کے لیے لائی ہوں تم خود ہی باورچی خانے میں جا کر کھا لو۔“

”بڑی خاطر میں ہو رہی ہوں خیر تو ہے نا۔“ نسرین نے آنکھیں میکا کیں۔

”نسرین آ جاؤ تم کھا لو، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تم نے صبح کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“ عاصمہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

”بس جی نہیں چاہ رہا۔“ نسرین سیری چار پائی پر آکر بیٹھ گئی اور اب مزے سے

روٹی پر کباب رکھے کھا رہی تھی۔

”تمہاری کتنی چھٹیاں رہ گئی ہیں؟“ اس نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔

”چھٹیاں تو چار پانچ ہیں لیکن میں شاید کل یا پرسوں لاہور چلی جاؤں وہاں سب

اداس ہوں رہے ہوں گے۔“ بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا حالانکہ میرا ایسا کوئی

ارادہ نہیں تھا۔

”کیا تم صبح چلی جاؤ گی؟“ نسرین کو پانی پیتے پیتے اچھو آ گیا۔

”میں کہتی ہوں سنائیں تھا، نسرین کیا کہہ رہی تھی کہ وہ آج کل میں لاہور جا رہی ہے اور لاہور جا کر تو۔۔۔“ مائی کی آواز قدرے مدھم ہوئی تھی میں نے اپنی ساری سماعتیں ان کی بات سننے پر لگا دیں تھیں۔

”میں نے اس کے کان میں بات تو ڈال دی تھی کہ عارفہ کی کیا خواہش تھی بس اب تم صبح ہی اس سے بات کر لو۔۔۔“

”کیا بات کروں شمو، تو کر لے۔“

”لے میں تو پرانی ہوں تو سگاماموں ہے۔ کیا بروائی ہے میرے وحید میں، گورا چٹا اونچا جوان ہے۔“

”کام و ام تو کچھ کرتا نہیں اور۔“ مائی نے ماموں کو ٹوک دیا۔

”ارے تو کیا فصیح احمد نہیں دے گا بیٹی کو کچھ، اتنا دولت مند ہے بس لاہور جانے سے پہلے دونوں کا نکاح ہو جائے۔ فصیح احمد صاحب تو شریف آدمی ہیں، چاچا کتنی تعریف کرتا تھا۔ اپنی عزت کے لیے خود دھوم دھام سے رخصتی کریں گے۔ آخر بیٹی ہے ان کی اور دیکھتے نہیں کتنے ٹھاٹھ سے رہتی ہے کتنا کھلا پیسہ خرچ کرتی ہے آج اپنی عاصمہ کو بھی دو ہزار روپے دیے ہیں سوٹ خریدنے کے لیے۔“

”لیکن وہ راضی نہیں ہوگی وحید سے نکاح کے لیے۔“ ماموں متذبذب سے تھے

”ارے تو راضی کرنا، کوئی چکر چلا، دیکھ وحید کے ابا وحید کا نکاح ہو جائے نا اس

سے پھر تو ہمارے وارے نیارے ہیں وحید کو میاں صاحب کام پر لگا دیں گے اور بیٹی کو بھی اس کی شایان شان کونھی، کار بنگہ دیں گے ہی اور پھر اس کا بھی حصہ ہے دو چار بچے ہو گئے اس کے تو پاؤں مضبوط ہو جائیں گے ہمارے بھی، ہم اس کے حصے کا مطالبہ کر دیں گے۔“

مائی بہت آگے تک سوچ رہی تھی مجھے ہنسی آگئی لیکن مجھے ان پر غصہ نہیں آیا یہ ان کی ضروریات تھیں ان کی تشنہ خواہشات تھیں جنہیں وہ میرے ذریعے سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ میں دبے پاؤں اپنے کمرے میں آگئی ان کی اپروچ اتنی ہی تھی وہ مجھے روکنے اور وحید

کے ساتھ میرا نکاح کرنے کے لیے کیا منصوبے بنا رہے تھے اس سے مجھے دلچسپی نہ تھی میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا مجھے اب یہاں نہیں رہنا تھا اور مجھے یہاں جاب بھی نہیں کرنا تھی۔ میں نے حسان کے فون پر میسج کیا۔

”مجھے فون نہ کرنا صبح ہوٹل سے مجھے پک کر لو پلیز، مجھے ایک بار پھر تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ فوراً ہی جواب موصول ہوا تھا۔

”میں آ رہا ہوں لیکن کیا تم کسی خطرے میں ہو کیا تم مجھ سے بات نہیں کر سکتیں۔“

”ہاں کسی حد تک!“ میں نے جواب دیا۔

”بات ممکن نہیں۔ میں صبح سے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکتی صبح یہاں سے ہوٹل

جاؤں گی اور پلیز اب میسج نہ کرنا اور پریشان مت ہونا۔“

لیکن کیا میرے لکھنے سے حسان کی پریشانی ختم ہو سکتی تھی اس وقت رات کے دو بجے تھے اور شاید وہ اسی وقت لاہور سے نکل پڑا تھا جب رات کی چلن سے صبح نے جھانکا تو میں ایک بار پھر ایک گھر سے چوروں کی طرح نکل رہی تھی ایک بار پہلے میں جس گھر سے نکلی تھی وہ میرا شہر محبت تھا میں نے کئی بار اسے رک رک کر دیکھا تھا لیکن آج میں جس گھر سے نکلی تھی یہ گھر میرا نہیں تھا اور میں پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز چلتی ہوئی جب ہوٹل کے گیٹ پر پہنچی تو وہاں صبح کے ملکچے سے اندھیرے میں حسان کو گاڑی سے ٹپک لگائے کھڑے دیکھ کر آج مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی بلکہ کسی آگئی، کسی ادراک نے اندر چراغاں کر دیا تھا۔

”تھیک گاڑا!“ مجھے دیکھتے ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”حسان مدحت کے سبب نہ واپس آ گئے ہیں کیا؟“

”نہیں!“

حسان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”تم اپنا سامان لے آؤ اندر سے!“

چوکیدار نے حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔

”میڈم ابھی تو دو تین چھٹیاں باقی ہیں۔“

”ہاں!“ میں نے اپنے کمرے سے سامان اٹھایا تھا اور یزائن لکھ کر چوکیدار کے حوالے کیا۔

”یہ میرا یزائن ہے بابا، ہنسی صاحب آئیں تو انہیں دے دیجیے گا۔“

یہ ایک پرائیویٹ کالج تھا اور یوں بھی میں ابھی تک عارضی طور پر تھی۔ حسان نے میرا ہینچی کیس لے کر گاڑی کی ڈگی میں رکھا اور تھوڑی دیر بعد ہم لاہور کی طرف عازم سفر تھے۔

”ہاں اب شروع ہو جاؤ۔“ مین روڈ پر آتے ہی حسان نے کہا تو میں نے سب

کچھ بتا دیا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی حسان یہ جان کر کہ پپا نے ایک۔۔۔“

”نہیں!“ خلاف توقع حسان نے جواب دیا۔ ”میں پہلے ہی حقیقت جان چکا

ہوں۔“

”اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں اور ان سات آٹھ دنوں میں ایک بار بھی مجھے فون نہیں کیا۔“ میں نے گلہ کیا۔

”تم نے مس کیا تھا؟“

”ظاہر ہے۔“ میں جھنجھلائی۔

”ایک بندہ جو پچھلے اڑھائی دو ماہ سے آپ کا سایہ بنا ہوا ہو وہ نہ لے۔“

مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ ”لیکن میں تمہیں جانتے ہو۔ بتا گیا تھا۔“

”مگر مجھے یقین تھا تم مجھے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔“

”اتنا یقین ہے مجھ پر۔“ اس نے ذرا سارخ موڑ کر مجھے دیکھا۔

”ہاں ہے۔“ میں نے پورے یقین اور مان سے کہا۔

”ویسے تم اکیلی کہاں تھیں تمہارے اپنے رشتہ دار تھے ناں تمہارے پاس۔“ اس

کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ میں شرمندہ ہو گئی۔

”دراصل میں ایک اور مجاز پر لڑ رہا تھا۔“

”کیا گھر والوں سے صلح ہو گئی؟“

”ہاں!“

”شکر ہے، یہ تو بہت اچھا ہوا۔ یہ بتاؤ تم نے پپا کا مجھے کیوں نہیں بتایا۔“

”دراصل مجھے کل ہی سب پتا چلا تھا کل صبح مارکیٹ میں رومی اور تمہاری ممالی

تھیں وہ تمہارے لیے بہت دگھی ہو رہی تھیں رومی نے مجھے بتایا تھا تمہاری جدائی میں تمہاری

ممایاں ہو گئی تھیں تمہارے جانے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ تم سے بھی رومی سے کم

محبت نہیں کرتیں۔“

”ممایاں ہو گئیں تھیں میرے لیے!“

”ہاں!“ حسان بخجیدہ تھا۔

اور پھر رومی کے اصرار پر میں نے بتا دیا تھا کہ تم خیریت سے ہو اور کہیں جاب کر

رہی ہو تمہیں یہ جان کر شاک لگا تھا کہ تم ممائی بیٹی نہیں ہو اور ڈیڑھ ماہ تک تم اس شاک سے

کل نہیں سکی تھیں جب رومی اور مماتم سے ملنے کو بے چین ہو رہی تھیں وہ تو اسی وقت تمہارے

پاس آنا چاہتی تھیں لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی نہیں ابھی ذرا کچھ دن تم اپنے ماموں کی

مخزانی سے لطف اٹھا لو پھر یہاں آنے کے بعد تمہیں شاید موقع نہ ملے۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو نا حسان۔“

آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ مماتم مجھ سے ناراض نہیں تھیں انہوں نے ایسا

نہی کہا تھا ناں۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا تھا اور ہولے ہولے ہلا رہی

تھی۔

”یار میں ڈرائیو کر رہا ہوں خیال رکھو اور پھر بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا

اور پتا ہے شام کو بی ریان اور پپا مجھ سے ملنے ہوٹل آگئے میں نے رومی کو اپنا ایڈریس بتا دیا

تھا تب مجھے پتا چلا کہ تم جیسی پاگل لڑکی دنیا میں کوئی اور نہیں ہے۔
”بکومت!“ میں نے ہولے سے اس کے بازو پر مکا مارا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ شادی کے آٹھ سال بعد جب اولاد نہ ہوئی تو میری والدہ چاہنے لگیں کہ میں دوسری شادی کر لوں اس کے لیے انہوں نے کئی لڑکیاں بھی دیکھ لیں اگرچہ میں اس کے لیے رضامند نہ تھا انہیں دنوں میرے بابا کے آفس کا ایک کلرک دو چار بار گھر آیا وہ اپنی بیٹی کے ساتھ آیا تھا شاید وہ اس کا علاج کروانا چاہتا تھا لیکن اس کی ملاقات وجیہ سے ہو گئی۔ حسان بتا رہا تھا میں وہیمان سے سن رہی تھی۔ وجیہ نے عارفہ کو دیکھا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر میں عارفہ سے شادی کر لوں تو غریب لڑکی ہے دب کر رہے گی اور اولاد کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی کیونکہ میں اکلوتا تھا اور میری والدہ میری دوسری شادی کے لیے بہت ضد کر رہی تھیں وجیہ کا خیال تھا کہ جلد یا بدیر میں والدہ کے سامنے ہار جاؤں گا اور اگر کوئی اس کے برادر کی لڑکی ہوئی تو ممکن ہے کہ میں اولاد ہو جانے کی وجہ سے اسے زیادہ توجہ دینے لگوں اور وہ پس منظر میں چلی جائے بہر حال اس کا ڈر اور خوف اپنی جگہ صحیح تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں منیر صاحب کی بیٹی سے شادی کر لوں گا لیکن بعض اوقات بہت سی انہونی باتیں ہو جاتیں ہیں میری والدہ کا عارفہ کے لیے مان جانا بھی حیران کن تھا۔ پتا نہیں وجیہ نے انہیں کیسے منایا تھا بہر حال وہ وجیہ سے محبت کرتی تھیں اور وہ ان کی من پسند بہوتھی ان کے شوہر کی بھیجی ہی نہیں ان کی بھانجی بھی تھی اور پھر وجیہ کو بات منوانے کا ہنر بھی آتا تھا۔ یوں عارفہ سے میری شادی ہو گئی وجیہ کی دل شکنی کے خیال سے میں نے عارفہ کو الگ فلیٹ لے کر دیا تھا اور ہفتے میں تین دن اس کے پاس اور تین دن وجیہ کے پاس رہتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہوا کہ وجیہ اور عارفہ دونوں کو ایک ساتھ ماں بننے کی نوید ملی تھی میری والدہ کا انتقال عارفہ کی شادی کے چھ ماہ بعد ہی ہو گیا تھا وجیہ چاہتی تھیں کہ میں عارفہ کو فارغ کروں اب خدا نے اسے بھی نوازا تھا لیکن میں اس ظلم کے خلاف تھا جس کی وجہ سے وہ بہت ٹینشن میں رہتی تھی اب یہ اس ٹینشن کی وجہ تھی یا نہ جانے کیا کہ وقت سے کچھ

پہلے اسے ہسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑا اور سیزیرین سے اس کی بیٹی ہوئی اس نے بڑے شوق سے اپنی بیٹی کا نام سمیعہ رکھا تھا لیکن اپنی پیدائش کے ٹھیک دس دن بعد اس بچی کا انتقال ہو گیا اور عارفہ نے چندرہ بعد ایک بچی کو جنم دیا اور خود نہ بچ سکی اس کے پچھپھڑے ختم ہو چکے تھے میں عارفہ کی بیماری سے لاعلم تھا۔ ممکن ہے وجیہ کو خبر ہو میں نے بچی وجیہ کی گود میں ڈال دی اور وجیہ کو اپنی بیٹی کا نعم البدل مل گیا اس نے سوئی کو اپنا دودھ پلایا جان سے زیادہ پیاری تھی وہ اسے، پھر پتا نہیں کب اس نے سوئی اور رومی میں فرق کرنا شروع کیا بخدا مجھے نہیں معلوم ہو سکا شاید، انسان کبھی کبھی اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اب تو وہ مجھ سے زیادہ تڑپ رہی ہے۔ خدا کے لیے حسان بیٹے مجھے مری بچی کے پاس لے چلو اسکے بغیر ہم سب بہت۔۔۔۔۔

”اور تم نے مجھے بتایا نہیں حسان، کیوں کیوں۔۔۔۔۔“

میرے آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور میں اس کے بازو پر ہولے ہولے مکے مار رہی تھی۔

”پاگل ہو تم، یہ کل شام کی بات ہے عصر کے وقت مجھے رومی اور ماملی تھیں اور آج صبح میں اور اکل آرہے تھے تمہاری خبر لینے کہ تمہارے فون پر بھاگا میں تمہاری طرف، ویسے یہ بتاؤ یہ ہر مشکل میں تمہیں میں ہی کیوں یاد آتا ہوں۔“

وہ نچلے ہونٹوں کا کونا دانتوں تلے دبائے مسکرا رہا تھا۔

”پتا نہیں!“ میرا دل زور سے دھڑکا۔

”میں بتاؤں؟“

اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے وہ میری طرف مڑا۔

”سامنے دیکھو پلیز!“

”یہ آنسو تو پونچھ لو۔“

میرے گیلے رخسار کو ایک لمحہ کے لیے اس نے اٹکیوں سے چھوا۔

لیکن میرا دل بجھا ہوا تھا اور میں مدحت سے شرمندہ شرمندہ سی مل رہی تھی۔
”تو کیا اب قاضی کا بندوبست بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔“ مدحت نے قہقہہ لگایا

تھا۔

”نہیں یہ معاملہ تھرو پر اپرچینل ہو گا۔“ حسان بھی ہنسا تھا۔

”تو کیا معاملات سیٹ ہو گئے؟“

”ہاں، تقریباً فائل گنگو ہونا باقی ہے۔“ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں
پہنچ گیا میں ان کی گنگو سمجھ نہیں پارہی تھی اور سچ تو یہ ہے میں نے کچھ خاص دھیان بھی نہیں کیا

تھا۔

”کیا انکل مان گئے ہیں؟“

”ماننا ہی پڑا ایک خواب سے میں دستبردار ہوا ایک سے وہ۔“

”یعنی؟“ مدحت اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”یعنی کچھ پانے کے لیے کچھ کھانا بھی پڑتا ہے۔“

”ویسے شہلا اتنی بری تو نہ تھی۔“

”بات بری یا اچھی کی نہیں ہوتی۔ بات ایک نفع سے دل کی ہے اور یہ ننھا سا

لو تعزاجب اڑ جائے ضد پر آ جائے تو پھر کسی کی نہیں سنتا اور نہ ہی اسے کچھ اور نظر آتا ہے۔“

”یعنی سادان کے ہرے کو ہر ای ہر نظر آتا ہے۔“ مدحت نے قہقہہ لگایا۔

”گھر کب جارہے ہو؟“

”شاید آج۔“

اور صرف یہ ایک بات تھی جو میں سمجھ پائی تھی تب ہی ملازمہ ٹرائی میں چائے کا

سامان رکھ کر لے آئی۔

”سوئی تم منہ ہاتھ دھو لو اور ہاں ناشتے میں کیا لوگی؟“

”صرف چائے ہی لوں گی۔“

”یہ آنسو۔۔۔ لیکن حسان۔“ میں پھر پریشان ہو گئی۔

”چپا۔۔۔ ماما۔۔۔ وہ۔“ میری ٹنگی بند گئی۔ ”میرے اس طرح آجانے سے ان کی

عزت۔۔۔ میں۔۔۔ میں کیسے اب اس خاندان کا حصہ بن سکتی ہوں لوگ کیا کہیں گے
الگیاں انھیں گی۔“

”ہاں یہ تو ہے!“

حسان سنجیدہ ہو گیا۔

”لیکن گھر چل کر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“

میرے دل پر افسردگی کا غبار سا چھا گیا میں کتنی بد نصیب ہوں میری جذباتیت

نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا تھا میرا شہر محبت، مجھ سے چھین لیا تھا کاش میں صبر اور حوصلے

سے حقیقت کو برداشت کرتی کاش میں اتنی احسان فراموش نہ ہوتی میرے اندر پچھتاوے

تھے دکھ تھا اپنی بے عقلی اور جذباتیت کا پچھتاوا اپنے پیاروں سے پھٹ جانے کا دکھ۔

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا حسان میں اب اس گھر میں جا کر ماما پاپا کو مزید بے عزت

نہیں کر سکتی بس تم ایک بار انہیں مجھ سے ملانے لے آنا حسان میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر

معافی مانگ لوں گی میں ریان اور وی کو گلے لگا کر بہت سارا ملوں گی میں بیاسے بھی سواری

کر لوں گی۔“

میں جب یہ کہہ رہی تھی اس وقت حسان مدحت کے خوبصورت گھر کے گیٹ

میں داخل ہو رہا تھا گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جب ہم اندر پہنچے تو مدحت دونوں پاؤں

صوفے پر رکھے شال چاروں طرف لپیٹ بیٹھی تھی۔

”یہ تم دونوں ہمیشہ ایسے ہی وقت میں کیوں دھاوا بولتے ہوں۔ کیا ناشتہ کہیں اور

نہیں ملتا۔“ مدحت کا انداز بڑا خوشگوار تھا۔

”دراصل گھر سے بھاگنے کے لیے سمیعہ کو یہ وقت بڑا مناسب لگتا ہے اور یہ

ہمیشہ مجھے سوتے سے اٹھاتی ہے۔“ حسان بھی شوخ ہو رہا تھا۔

”ارے واہ صرف چائے کیوں، گرما گرم پراسٹے بناؤ بھی سوی نے آج بھی کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ حسان نے فوراً کہا تھا۔

وہ بہت ہی خوش نظر آ رہا تھا میں خوش نہیں تھی مجھے ابھی کچھ فیصلے کرنے تھے پھر سوچتا تھا مجھے اب کہاں جانا ہے کیا مجھے فوراً پہلے کی طرح کوئی جاب مل سکتی ہے یا نہیں، ایک یقین تھا کہ حسان ضرور میری مدد کرے گا پھر بھی دل آپ سیٹ تھا ناشتے کے کچھ دیر بعد حسان باہر نکل گیا تھا اور میرا دل جیسے سینے کی چادر یواری سے باہر نکلنے کو بیتاب ہو رہا تھا۔ مدحت جانے مجھ سے کیا کیا کہہ رہی تھی میں نے شعوری کوشش سے اپنے خیالات جھٹک کر اپنی توجہ مدحت کی طرف کی تھی۔

”حسان نے بڑی جنگ لڑی ہے تمہارے لیے سوی، تمہیں پتا ہے تمہارا نام لیے بغیر اس نے اپنے پپا کی منتخب کی ہوئی لڑکی کو رجسٹر کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کو پسند کر چکا ہے اس نے پہلے بھی میڈیکل میں نہ جا کر انہیں دکھ پہنچایا اب دوسری بار وہ انہیں disobey کر رہا تھا تو انہیں غصہ آ گیا لیکن اب وہ مان گئے ہیں دراصل آئی نے مجبور کیا ہے انہیں، خود وہ بھی شاید اندر سے کمزور ہو گئے ہیں حسان چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا بھی تو بہت تھا۔“

میرے لیے یہ انکشاف بہت خوش کن تھا لیکن میں پوری طرح خوش نہیں ہو سکتی تھی میرا دل عجیب سی کیفیات میں گھرا ہوا تھا ذرا سی آہٹ پر میرا دل جیسے میرے قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔

”ویسے تم ہو بہت پیاری، حسان کا انتخاب بہت اچھا ہے لیکن۔۔۔۔۔“

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر سامنے دیکھنے لگی جہاں سے حسان کے ساتھ ردی آ رہی تھی اس کے پیچھے کون تھا میں نے نہیں دیکھا آنسوؤں نے میری آنکھوں کے سامنے دھندلی چادر تان لی۔ میں بیتابانہ انہی تھی اور پھر میرے بازوؤں نے روی کو سیٹ لیا تھا دونوں بازوؤں میں اسے بٹھینچے میں بے آواز رو رہی تھی روی روتے روتے گلہ کر رہی تھی پوچھ

رہی تھی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا سوی، ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی آئیں؟ کیا تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میں اکیلی تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔ کیا تمہیں کبھی ہماری یاد نہیں آئی تم اپنی عالم تو نہیں تھی پھر اتنی ظالم کیوں بن گئیں۔“

”روی۔۔۔۔۔ رو موسوی۔۔۔۔۔ سوری مجھے معاف کر دو نا۔“ لیکن میں اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ پھر یکدم کسی نے روی کو کندھوں سے پکڑ کر الگ کیا میری نظریں انہیں اور میری چیخ نکل گئی دھپا تھے۔

”پپا میں بری ہوں بہت بری۔ میں نے آپ سب کو دکھ دیا ہے پلیز پاپا مجھے معاف کر دیں میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں بہت زیادہ، میں آپ سے الگ ہو کر ایک دن بھی خوش نہیں رہی۔“

”ناؤ ریلیکس سوی، اٹس اوکے جو ہوا سو ہوا۔ کچھ غلطی ہماری بھی تھی میں تمہیں تمہارے رشتوں سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا یہ وجہی کی خواہش تھی کہ تمہیں کبھی معلوم نہ ہو کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔ سو یہ غلطی مجھ سے ہوئی کہ میں نے تمہارے ماموں کو۔۔۔۔۔“

”پپا پلیز کچھ مت کہیں۔“

میں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی تب ممانے مجھے گلے لگا لیا ماما کے سینے سے لگ کر جیسے برسوں کی غفلت بجھ رہی تھی وہ میری سگی ماں نہیں تھی لیکن انہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا۔ آہ میں۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا، میری بشری کمزوری سمجھ کر۔“

”مما اس طرح نہ کہیں، ایسا مت کریں۔“

ریان مجھ سے خفا تھا وہ میرے قریب نہیں آیا تھا بس ایک طرف خاموش سے کھڑا ناراض ناراض سا مجھے دیکھ رہا تھا۔ ماما کے بازوؤں سے نکل کر میں اس کی طرف لپکی تھی۔

”راؤ میرے بھائی۔“ دو سال پہلے کی طرح میں اس کے ہاتھ چوم رہی تھی اور رو

رہی تھی اور وہ یوں ہی ساکت کھڑا تھا وہ ایسا ہی تھا مجھے پتا تھا اندر سے وہ پکھل رہا ہو گا گداز ہو رہا ہو گا لیکن اسے مجھ سے ناراض ہونے کا، خفا ہونے کا پورا حق تھا۔

”مت بات کرو مجھ سے سونی!“

وہ مجھ سے ہاتھ جھڑا کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور اب کبھی اس کا ہاتھ پکڑتی کبھی بازو۔

”یہ جذباتی سین کچھ زیادہ لمبا نہیں ہو گیا مدھو کچھ چائے پانی۔“

یہ حسان تھا جس نے یکدم میری جذباتیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ سب مجھے دیکھ رہے تھے میں یکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور نظریں جھکا لیں۔

”اوہ بی بی جوس لاؤ۔“ تب ہی بی بی جوس کے گلاس ٹرے میں لے اندر آئی وہ

ایک گلاس لیے میری طرف بڑھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”لے لو اتنی انرجی ویسٹ ہو گئی ہے۔“

حسان بالکل میرے قریب کھڑا مسکرا رہا تھا پھر اس نے ٹرے سے ایک گلاس اٹھا

کر مجھے دے دیا۔

”بی بی ناشتہ بنالو۔“

مدحت نے بی بی کو لاؤنج سے باہر جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”نہیں نہیں، ہم ناشتہ نہیں کریں گے بس اب چلتے ہیں بیا کی طبیعت کچھ ٹھیک

نہیں تھی۔“

”کیا ہوا بیا کو؟“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”وہی بلڈ پریشر ہائی ہے کل سے۔“ ممانے ایک شاکی نظر مجھ پر ڈالی تھی اور یہ

نظر مجھے اندر تک کاٹتی چلی گئی تھی بیا مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں کم از کم گھر چھوڑنے سے پہلے

میں بیا سے تو شیر کرتی یہ سب اور پھر یہ نقصان نہ ہوتا جو ہو چکا ہے آخر پہلے بھی تو ہر بات ان

سے شیر کرتی تھی۔ بیا جوس پی کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”چلیں!“

”پلیز، لائٹ سانا شتہ۔“

مدحت نے پھر کہا تو بیا نے معذرت کر لی۔ تو یہ سب صرف اتنی سی دیر کے لیے تھا ابھی تو دو ماہ کی تحقیق نہیں بجھی ابھی تو میں نے جی بھر کے ان سب کو دیکھا بھی نہیں اور ابھی تو میں نے ریان کو بھی نہیں منایا جواب بھی روٹھا روٹھا سا بیٹھا ہے میرا دل چاہ رہا تھا بیا کی منت کروں ممانے التجا کروں تھوڑی دیر اور میرے پاس بیٹھیں لیکن کیا میں اس قابل تھی کہ التجا کرتی کتنا دکھ دیا تھا میں نے ان سب کو۔

”چلو بیٹا اپنا سامان لے آؤ۔“ بیا کہہ رہے تھے۔

”میں۔۔۔ بیا میں!“ میں نے حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹا۔“

”لیکن میں۔۔۔ ممالوگ کیا کہیں گے آپ کو۔۔۔“

میرے آنسو پھر میرے رخساروں پر بہہ آئے۔

”میں بھلا کیسے جاسکتی ہوں آپ کے ساتھ، لوگ آپ کو طعنے دیں گے مذاق

کریں گے بیا میں یہ برداشت نہیں کر سکتی مجھے اپنی غلطی کی سزا خود ہی بھگنا ہے۔“

”ارے لوگ بھلا کیوں طعنے دیں گے۔“

ممانے یکدم آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا کسی کو تمہارے متعلق کیا علم ہے ہم کوئی کسی گلی محلے میں تو نہیں رہتے کہ سارا محلہ باخبر ہو کہ ساتھ والے گھر میں کیا ہو رہا اور رہے ملازم تو انہیں یہی بتایا گیا ہے کہ تم انگلیٹڈ اپنے ماموں کے گھر گئی ہوئی ہو۔

میں ممانے کے بازوؤں کے حصار میں گھری گھری تھی ایک بار پھر میرے آنسو

میرے رخساروں پر بہہ نکلے تھے میں ان سب کو چھوڑ کر چلی گئی تھی ان سب کی عزت کا خیال

کیے بغیر اور انہوں نے مجھے بے وقعت نہیں ہونے دیا تھا۔

”مما۔۔۔ ممانہ سوری، ام رنکی ویری سوری۔“

ممانے میرے آنسو پونچھے۔ ”بہت رولیا، اب گھر چلو۔“

میری نظریں یکدم ریان کی طرف اٹھ گئیں وہ ابھی تک مجھ سے غمگین تھا۔

”سوی چلو گھر پلیز، ایسا کچھ نہیں ہونے والا جو تم سوچ رہی ہو۔“

ریان نے یکدم آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے مڑ کر اسے دیکھا اس کی ناراض آنکھوں میں اپنائیت اور محبت کے رنگ تھے میں کتنی خوش نصیب تھی یہ ساری محبتیں میرے لیے تھیں یہ سب مجھے لینے آئے تھے تو میں کیوں اپنے شہر محبت میں نہ پلٹ جاتی۔

میرا شہر محبت جہاں میرے لیے محبتیں تھیں بیاہ تھا چاہت تھی اپنے شہر محبت میں قدم رکھتے ہی میرا دل چاہا تھا کہ ایک ایک کونے سے لپٹوں ایک ایک کونے کو چوم لوں کتنا غلط کیا تھا میں نے۔ میری سوچ کتنی غلط تھی۔ بیاہ کے گلے لگ کر میں نے ڈھیر سارے آنسو بہائے تھے کسی نے مجھے ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا کوئی بھی مجھ سے ناراض نہ تھا ماما پاپا سمجھ رہے تھے کہ کہیں نہ کہیں ان سے بھی غلطی ہوئی ہے لیکن میں جانتی تھی سارا قصور میرا ہے اپنے نکلے والدین بھی بعض اوقات اپنے سب بچوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے تو کیا وہ میری طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور اگر حسان نہ ہوتا اگر میرے ساتھ کچھ غلط ہو جاتا تو۔۔۔

اس روز میں نے تقریباً تین ماہ بعد پڑ گھر کے ڈانٹنا۔ ہال میں بیٹھ کر ب کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور اس روز مجھے اپنی خوش قسمتی پر کوئی شک نہیں رہا تھا اور اس روز پاپا، ماما، ریان اور رومی گھر ہی رہے تھے اور اس روز میں نے پاپا ماما اور رومی سے اپنی اب تک کی زندگی میں سب سے زیادہ باتیں کیں تھیں ممانے اس روز مجھے میرے بچپن کی وہ باتیں بتائیں تھیں جو بیاہ کئی بار مجھے بتا چکی تھیں لیکن ممانے ان سب کو سننا بہت اچھا لگا تھا اس روز میں رات کو اپنے بیڈ پر لیٹی تھی تو ایک بار پھر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں پتا نہیں اتنے دن میں کیسے اس گھر سے دور رہ لی تھی اور اب کبھی میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی میں نے خود سے عہد کیا تھا اور جب رات کو رومی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

”سوی دروازہ کھولو۔“

اور بغل میں اپنا ٹیکے دیائے جب وہ مندی مندی آنکھوں کے ساتھ اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھی تو مجھے لگا تھا جیسے بیچ میں یہ تین ماہ آئے ہی نہیں تھے سب کچھ ویسا ہی تھا ہاں سب کچھ ویسا ہی تھا بس مبادلہ کئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنے اندر چھپائے محبتوں کے سارے خزانے میرے لیے کھول دیئے ہوں میرے لیے ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہوتی ہوتیں۔

”سوی تم نے دودھ لیا۔ سوی تم نے اتنا کم کھایا۔ میرا خیال ہے آج شاپنگ کے لیے چلو۔“

میں دن میں کتنی ہی دفعہ سو رہی کرتی۔

”پاگل ہو تم!“ وہ پیار سے مجھے دیکھتیں۔

”ماما میں اب کبھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی میرا جی چاہتا ہے ماما کہ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں اور آپ کی محبتوں کا جرعہ جرعہ ہتی رہوں۔“ ایک دن جب ہم لان میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے ممانے کہا تھا۔

’بیٹیاں سدا میکے میں نہیں رہتیں انہیں رخصت بھی کرنا ہوتا ہے میری جان اور ہم بھی اب جلد ہی تمہیں رخصت کر دیں گے۔“

اور تب رومی اور ریان نے مجھے مسکرا کے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ماما کیا سوچ رہی تھی میرے متعلق لیکن میرے ذہن میں اس وقت فیضان کا خیال نہیں آیا تھا بلکہ اگلے کئی دن میں نے فیضان کے متعلق نہیں سوچا تھا ہاں حسان کا خیال کئی بار آیا تھا لیکن میں نے واپس آنے کے بعد اسے فون نہیں کیا تھا پتا نہیں کیوں شاید مجھے اس کے فون کا انتظار تھا رومی اور ریان مسکرا رہے تھے میں نے ممانے کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر لاڈ سے کہا تھا۔

”جی نہیں مجھے کہیں نہیں جانا میں تو بس ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔“

ماما مسکرا دی تھیں۔

”اور وہ سارے لاڈ کروں گی جو بچپن میں نہیں کیے تھے۔“ ریان نے کہا تھا۔ مہر کی ہنسی گہری ہو گئی تھی۔

”ویسے ماما آپ نئے ایکشن میں بھی کھڑی تو ہوں گی نا۔“
”دیکھوں گی۔“

وہ ریان کی طرف متوجہ تھیں میں بھی ریان کو دیکھ رہی تھی جب اچانک میری نظر روی پر پڑی وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی ارد گرد سے جیسے بالکل بے خبر اور میں نے تب غور کیا تھا کہ وہ اداس ہے بلکہ اکثر بات کرتے کرتے کھو جاتی ہے اور ایک نامعلوم سی اداسی اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتی ہے تب اس روز ماما کے جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا تھا ”کیا بات ہے روی، تم کچھ اپ سیٹ لگتی ہو۔“
”نہیں تو کچھ بھی نہیں، تمہارا وہم ہے۔“

اور اس روز سنڈے تھا روی ابھی سو رہی تھی اور حسب معمول میں نے اسے سونے دیا تھا اور خود ناشتہ کر کے بیا کی طرف چلی آئی تھی بیا دھوپ میں بیٹھی تھیں میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”بیا میں سوچ رہی ہوں جاب کر لوں کہیں، پنجاب یونیورسٹی سے کلیدیکل سائیکالوجی میں ڈپلومہ لینے کے بعد کہیں نہ کہیں جاب تو مل ہی جائے گی اب۔“
”اب جاب اپنے سسرال میں ہی جا کر کرنا۔ نجیب کہہ رہا تھا کہ وہ جلد ہی فیضان کی شادی کرنے پاکستان آرہے ہیں۔“

”فیضان کی شادی!“

میں حیران سی بیا سے کو دیکھ رہی تھی۔

”نجیب نے فیضان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔“

”کیا اب بھی۔۔۔“ ابھی تک میں حیران تھی۔

میرے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد بھی۔

”جیانا تم سے بات نہیں کی؟“

میرا سر نفی میں ہل گیا تھا لیکن دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا حسان، کیا میں حسان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں میں نے اپنے دل سے سوال کیا تھا شاید نہیں۔

چاہے وہ فیضان ہی کیوں نہ ہو جس نے پہلی بار میرے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا شاید وہ وقتی لگاؤ تھا وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا جس نے مجھے سراہا تھا میرے لیے محبت بھرے لفظ بولے تھے اور شاید اس کے لیے دل میں کچھ الگ محسوس کرنا نچرل تھا یہ عمر کا ایسا ہی دور تھا جب اس طرح متاثر ہو جانا ہی فطری تھا لیکن محبت۔۔۔۔۔ محبت تو شاید میں نے حسان سے ہی کی ہے ممکن ہے ان دنوں میری شادی فیضان سے ہو جاتی تو اس تعلق کی وجہ سے اور اس رشتے کی وجہ سے جو ہمارے درمیان بننا وہ لگاؤ محبت میں بدل جاتا بلکہ یہ ہی ہونا تھا لیکن اب۔۔۔۔۔ میں چپ سی بیٹھی تھی۔

کیا میں ماما پاپا کو انکار کر سکتی ہوں اگر وہ میرے لیے فیصلہ کر چکے ہیں جبکہ میں پہلے ہی انہیں دکھ پہنچا چکی ہوں اگر چہ انہوں نے فراخ دلی سے مجھے معاف کر دیا تھا لیکن اب کیا میں پھر نہیں شاید میں ایسا نہ کر سکوں اور حسان مجھ سے محبت کرتا تھا ہر مشکل میں اس نے میرا ساتھ دیا تھا میری خاطر گھر چھوڑا تھا گو اس نے مجھے خود سے نہیں بتایا تھا لیکن میں جانتی تو تھی نا۔ مدحت نے مجھے بتایا تو تھا ایک طرف حسان تھا اور دوسری طرف ماما پاپا تھے۔

”تمہارے بال کتنے روکھے ہو رہے ہیں چندا، اوھر آؤ میں تیل لگا دوں۔“

بیا نے کہا تو میں انہیں چونک کر دیکھنے لگی۔ وہ میرے اور روی کے سر میں دس چندرہ دن بعد ضرور تیل لگاتی تھیں وہ انھیں اور تیل کی شیشی لے آئیں میرا ذہن یکدم خالی سا ہو گیا تھا میں کیا فیصلہ کروں گی ابھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا بیا میرے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے ایک بار پھر میری شادی کی باتیں کرنے لگیں۔

کو مری ضرورت ہے میں نے سوچا تھا۔

لیکن کیا ان تین ماہ میں ہمارے درمیان اتنی اجنبیت درآئی ہے کہ وہ مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر نہیں کر سکتی میں بہت افسردہ تھی۔

کاش کوئی میری زندگی سے یہ تین ماہ نکال دے۔

رات کو جب وہ حسب معمول سونے کے لیے میرے کمرے میں آئی تو میں اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگی اب وہ جلد ہی میرے کمرے میں آجاتی تھی اسے آدھی رات کو آنے ضرورت نہ تھی عموماً ڈنر کے فوراً بعد ہی وہ میرے کمرے میں آجاتی تھی۔

”سب ٹھیک ہے سونی ہر ٹیسٹ میں سب سے اچھے نمبر ہوتے ہیں۔“

”کسی ہیلپ کی ضرورت ہے؟“

”نو۔۔۔۔۔ اور یوں بھی۔۔۔۔۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

”چند ماہ بعد تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم شاید امریکہ چلی جاؤ یا شاید یہاں ہی رہو دونوں صورتوں میں تمہارے بغیر ہی خود سے پڑھنے کی عادت ڈالنا ہے نا مجھے۔“

”رومی تمہیں فیضان کیسا لگتا ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا تھا۔

”بہت اچھے ہیں فیضان بھائی اور تم بہت لگی ہو۔“

”وہ کیسے بھی فیضان کی اچھائی سے میرے لگی ہونے کا کیا تعلق ہے؟“

میں نے بے دھیانی سے اسے دیکھا اور وہ جیسے میری نا سنجھی پر حیران ہی ہوئی۔

”ظاہر ہے ایک اتنا اچھا شخص تمہارا رفیق زندگی بنے گا تو تم خوش قسمت ہی ہوئیں نا۔“ میں نے بغور اسے دیکھا تو اس نے کروٹ بدل کر کبل میں منہ چھپالیا۔

تو کہیں نہ کہیں کوئی بات ہے جو میں نہیں سمجھ پا رہی میں نے سوچا اور مجھے یاد آیا

اس روز جب ممانے کہا تھا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں اس روز انہوں نے کچھ اور بھی تو

کہا تھا میں نے یاد کرنے کی کوشش کی وہ کچھ اور کیا تھا ہاں شاید نہیں بلکہ یقیناً ممانے کہا تھا

رومی فیضان سے محبت کرتی ہے اور یہ یعنی محبت کا ہو جانا کوئی ناممکن بات تو نہیں تھی کم عمر

”میں نے تو نجیب سے کہا ہے کہ بس اب وہ پاکستان میں ہی رہے بہت خاک چھان لی ہے اس نے باہر کی اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو اتنی دور نہیں بھیج سکتے۔ اتنے دن وہ ہم سے دور رہی تو مانو جیسے زندگی ختم ہو گئی تھی۔“

یہ محبتیں میں نے محض ایک ذرا سی بات پر ان ساری محبتوں کو بھلا دیا تھا۔

میں نے ایک متفکری نظر بیا پڑا لی تھی۔

”بیا سومی کی شادی کب تک ہے؟“

رومی بیا سے پوچھ رہی تھی۔

”ہمارے ایگزام کے لحاظ سے شادی کی تاریخ رکھیے گا۔“ میں نے رومی کی

طرف دیکھا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی میرے دیکھنے پر

اس نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔

”نجیب تو کہہ رہا تھا کہ وہ جلد ہی سٹیٹس کنفرم کروا کے اطلاع دے گا کہ کب

آ رہے ہیں اور شادی کی تاریخ وغیرہ وہاں آ کر ہی طے پائے گی نا اور تمہارے ایگزام کے

بعد ہی کی کوئی تاریخ رکھیں گے تم بے فکر رہو۔“

بیانے مسکرا کر اسے دیکھا تھا لیکن رومی یکدم ہی اٹھی تھی۔

”ارے بیٹا بیٹھو تمہارے بالوں میں بھی تیل لگا دوں۔“ بیانے اسے روکا تھا لیکن

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس کی تھی ایک بار پھر میں نے لوٹ کیا تھا

کہ وہ کچھ افسردہ اور اداس سی ہے لیکن کیوں۔۔۔ مجھے اس کا جواب نہیں معلوم تھا۔ کیا

کہیں۔۔۔ وہ ناظمہ شیرازی۔۔۔ میرا دل کا نپا تھا لیکن پھر میں نے فوراً ہی اس خیال کو رد

کر دیا تھا۔ نہیں رومی اتنی بے وقوف ہرگز نہیں ہے کہ میرے بتانے کے باوجود وہ ناظمہ

شیرازی سے کوئی ربط رکھے۔ تو پھر۔۔۔ میں سارا دن رومی کو لوٹ کرتی رہی اور اسی کے

متعلق سوچتی رہی ایک بار پھر میرے ذہن سے فیضان اور اپنی شادی کا خیال نکل گیا تھا رومی

”کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے سومی؟“

وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا اور اس کے لہجے میں تشویش جھلکنے لگی تھی۔

”ہاں“

بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بے چمن ہو گیا تھا

”وہ حسان، مدحت نے کہا تھا کہ تم میرا مطلب ہے تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے

“——”

”اوگاڈ اتنی سی بات کی تصدیق کے لیے تم نے رات کے دو بجے مجھے جگایا ہے کیا

تم صبح تک صبر نہیں کر سکتی تھیں ظالم لڑکی۔ ویسے یہ مدحو، اس سے تو میں بعد میں بات کروں گا

میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ دس دن سے رومانی ٹاول پڑھ پڑھ کے آنکھوں میں آشوب

چشم ہو گیا ہے سوچا تھا کسی روز شالاماریا مقبرہ جہانگیر کے کسی کونے میں بیٹھ کر زبردست قسم

کے رومانی ڈائلاگ بول کر تمہارا دل تم سے مانگوں کا خیراب مدحو کی بات کی تصدیق

کہتا ہوں کہ میں حسان رضا باگئی ہوش و حواس اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے سیدہ

احمد ولد فصیح احمد سے زبردست قسم کی محبت ہو گئی ہے اور۔۔۔۔۔“

اس کے لہجے کی شوخی مجھے اچھی لگ رہی تھی اور اس کے الفاظ نرم نرم پھوار کی

صورت میں میرے دل پر برس رہے تھے۔

”اب سو جاؤں سوی؟“

کچھ دیر بعد وہ معصومیت سے یو چہرہ ہاتھا۔

میں چوکی۔

”در اصل وہ نجیب ماموں اور ماما۔۔۔۔۔“ میں نے حسان کو پوری بات بتادی تو

کتنی بار احساس دلایا تھا کہ فیضان اور رومی۔۔۔۔۔ رومی اور فیضان مجھے اس لمحے رومی

بے حد پیار آیا تھا وہ میری خاطر میرے لیے اپنے احساسات چھپا رہی تھی۔

”سوی پلیز لائٹ آف کر دو۔“

اس نے کبل میں منہ چھپائے چھپائے کہا تھا یہ ایک اور غیر متوقع بات تھی اور

جب تک جاگتی رہتی تھی لائٹ نہیں آف کرنے دیتی تھی اسے لائٹ میں ہی سونے کی عادتیں

تھی میں نے بتا کچھ کہے لائٹ آف کر دی تھی پتا نہیں وہ کب سوئی تھی مجھے معلوم نہیں لیکن

مجھے غیند نہیں آ رہی تھی رات کے دو بجے جب میں اپنا سیل فون اٹھائے میسر بر حارہ تھی

تو میں نے مڑ کر ایک نظر روی پر ڈالی تھی حسب معمول سوتے میں اس نے کھل اتار دیا تھا

اور نائٹ بلب کی مدہم روشنی میں اس کے رخسار پر آنسوؤں کے نشان صاف دکھائی دے

رہے تھے اور چند لمحوں بعد ہی میں ٹیرس برکھڑی سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی حسان کو فون کر رہی

“**五**”

وہ گہری نیند سے جاگتا تھا۔

”حسان سنو!“

”اوہ گاڈ یہ تم ہو سوسی۔“

”ہاں حسان سنو وہ۔۔۔۔“ اور میری سمجھ میں نہ آتا کہ میں بات کس طرح شروع کروں۔

کروں وہ یکدم الرٹ ہو گیا۔

”یا اللہ خیر، موی اب کہا ہوا کہا پھر سے گھر سے ہاگنے کا ارادہ ہے اب تو

”تمہیں اپنے بیا اور مہما کے متعلق۔۔۔“

”نہیں حسان وہ۔۔۔۔۔“

’بار میں اس وقت مہاسا کے گھر میں ہوں اور میرے بڑے بھائی کو اس سے مجھ کو

تھے جب ممانے میری طرف دیکھا۔ ”بیٹا ایک کپ چائے بنا دو میرے لیے۔“
میں نے چائے دانی اپنی طرف کھسکائی۔

”سوی بیٹا نے تمہیں بتایا ہوگا کہ بھائی جان نے فیضان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا

ہے؟“

”جی!“ میرا سر جھک گیا تھا۔

اور چائے ماما کی طرف بڑھاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کیسے، کس طرح ماما

سے بات کروں۔

”فیضان بہت اچھا لڑکا ہے تم نے اس کے یہاں قیام کے دوران کچھ تو اندازہ لگا

لیا ہوگا اس کی نچر کا۔“ مجھے خاموش دیکھ کر ممانے پھر کہا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ماما کے

پاس آگئی۔

”ماما!“ میں نے ان کے پاس نیچے کا رہٹ پر بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر

ہاتھ رکھا میں ہمیشہ ہر بات کہنے کے لیے پاپا کے پاس جاتی تھی رات بھی حسان سے بات

کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ میں صبح پاپا سے بات کروں گی لیکن آج میں ماما کے پاس

بیٹھی تھی اور ماما سے وہ سب کہہ رہی تھی تو شاید اتنی بے تکلفی سے آج سے قبل کبھی ماما سے نہ

کہہ سکتی تھی ماما حیرت سے میری بات سن رہی تھی۔

”لیکن فیضان، بیٹا اس نے خود تمہارے لیے کہا تھا۔“

”فیضان سے میں بات کر لوں گی ماما لیکن رومی، ماما رومی کی حالت دیکھی ہے

آپ نے وہ۔۔۔“ میں جھجک سی گئی تھی۔

”وہ فیضان سے محبت کرنے لگی ہے۔“

”کیا اس نے تم سے کہا؟“

انہوں نے حیران سے مجھے دیکھا۔

”نہیں ماما لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ۔۔۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی ہے کتنی

وہ ہولے سے ہنسا۔

”ویسے سوچ لو سووی ابھی وقت ہے میں بے چارہ غریب سا لیکچرار ہوں میرے

ساتھ گزرا کر لوگی۔“

”یکومت!“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”ویسے یہ ساری بات تم مجھ سے صبح بھی کر سکتی تھیں۔“ خدا حافظ کہنے سے پہلے

اس نے جتایا تھا۔

”اور صبح تک میرا ارادہ بدل جاتا تو۔۔۔“

میں نے بھی اسے تنگ کیا۔

”یکومت۔۔۔ ارادہ بدل کر دیکھو۔“

اب وہ مجھے ڈانٹ رہا تھا اور میں ہنس رہی تھی اور جب میں کمرے میں آئی تو

سرودی سے کانپ رہی تھی اور ہاتھ ٹھنڈے بنے ہوئے تھے لیکن میرا دل پر سکون تھا اب حسان

خود ہی سنبھال لے گا سب۔

اگرچہ میں نے دو چار گھنٹے نیند لی تھی لیکن پھر بھی جب میں صبح اٹھی تو بہت فریش

تھی۔ جب کہ رومی بہت تھکی تھی اور غڈ حال لگ رہی تھی ناشتہ کرتے ہوئے ممانے اس سے

پوچھا تھا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے رومی۔

”نہیں سر میں درد ہے۔“

وہ صرف چائے کی ایک پیالی پی کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے جاتے جاتے

ریان سے کہا تھا کہ وہ آج کانج نہیں جائے گی اس لیے وہ چلا جائے۔

”بیٹا ایک سلاکس لے لو اور پھر ٹیبلٹ لے لیتا۔“

ممانے نے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

”ابھی جی نہیں چاہ رہا کچھ دیر بعد لے لوں گی۔“

وہ چلی گئی اور ریان بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا ٹیبل پر میں اور ماما ہی رہ گئے

اپ سیٹ لگ رہی ہے۔“
 ”فصیح صحیح کہتے تھے کہ تم مجھ سے زیادہ اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھتی ہو ہر بات پر نظر ہوتی ہے تمہاری۔“

مما کی آنکھوں میں میرے لیے ویسی ہی شفقت و محبت تھی جیسی رومی اور ریان کے لیے ہوتی تھی آج مجھے ان کی نظر سپاٹ نہیں لگ رہی تھی آج ان سے محبتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے وہ میرے لیے پریشان تھیں ان کا دل نہیں مان رہا تھا کہ میری حق تلفی کریں۔

”لیکن سوی میری جان تم بڑی ہو اور پھر بھائی جان نے بھی تمہارا ہی کہا تھا رومی کو میں سمجھا لوں گی خود بات کرتی ہوں میں اس سے، کیا پتا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔“
 ”نہیں ماما۔۔۔ اور پھر آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں حسان کے والدین بھی ادھر آنا چاہتے ہیں۔“
 ”مما کی نظریں میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی تھیں اور حتی الامکان اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی تھی۔“
 ”تم حسان کو پسند کرتی ہو سوی؟“

”حسان اچھا ہے لیکن ماما اگر رومی کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہوتا آپ کا حکم میرے لیے سب سے بڑھ کر تھا۔“

”تم حسان کے ساتھ خوش تو رہو گی نا۔ فیضان کیا۔۔۔ مطلب ہے کیا تم فیضان کو پسند نہیں کرتیں۔“
 ”مما ہر طرح سے اپنی تسلی چاہتی تھیں اور میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اب مجھے فیضان سے بات کرنی تھی فیضان کے ساتھ میں نے بہت سارا وقت نہیں گزارا تھا میں اور رومی دونوں ہی خوبصورت تھے گو ہماری مائیں الگ تھیں پھر بھی کبھی کبھی ہم دونوں بہت مشابہ لگنے لگتی تھیں میں چونکہ عمر میں بڑی تھی اس لیے نیچرل بات تھی کہ اس کا رجحان میری طرف تھا مجھے یقین تھا وہ رومی کے ساتھ بہت خوش رہے گا وہ میرے جیسی ہی تو ہے ہر طرح سے بات چیت، اٹھنا بیٹھنا، شوق، دلچسپیاں سب ایک۔“

اس روز میں نے فیضان سے بات کی تھی پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں وہ گرم جوشی نہیں تھی اس کا انداز بھی قدرے جھجکا ہوا سا تھا۔
 ”یہ کوئی ایسی بات نہ تھی سوی کہ تم اس طرح گھر چھوڑ کر چلی جاتیں تم کم از کم مجھ سے تو بات کر سکتی تھیں نا۔“

”غلطیاں بھی تو انسانوں سے ہوتی ہیں فیضان اور میری بھی غلطی تھی یہ۔۔۔ خیر اس وقت میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ ممانے مجھے بتایا تھا کہ کہ ماموں جان نے تمہارے لیے مجھے پرپوز کیا ہے۔“

”میرا خیال ہے یہ بات میں تمہیں بتا چکا ہوں اور یہ تمہارے گھر سے جانے سے پہلے کی بات تھی۔“

”ہاں لیکن ممانے مجھ سے اب ذکر کیا ہے۔“ میں نے اس کے لہجے کو انور کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

”اور ماما کو میں نے بتایا ہے کہ رومی تمہیں چاہتی ہے اور تمہیں بھی یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے۔“

”رومی!“ اس کی آواز میں حیرت تھی۔

”ہاں، میں چاہتی ہوں فیضان کہ تم رومی سے شادی کرو وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔“

”اور تم؟“

اس نے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا تھا اس کے لہجے میں کوئی چٹائی نہ تھی بالکل نارمل سا انداز تھا اس کا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تم اس واقعے کے بعد میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گے ہمارے درمیان کہیں نہ کہیں کوئی کک رہے گی اور پھر میں حسان کے ساتھ زیادہ خوش رہوں گی۔“

اور مجھے لگا جیسے اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی ہو، بہر حال وہ ایک مرد تھا اور میرا اس طرح گھر سے چلے جانا اس کے علم میں تھا۔

”یہ حسان وہی لڑکا ہے، تاہم راکلاس فیلو۔“ وہی نارل لہجہ۔
”ہاں!“

”او کے وٹس یو ٹو گڈ لک، ڈیڈ پیچھو سے بات کر لیں گے۔“

یہ ایک بڑا مسئلہ تھا جو آسانی سے حل ہو گیا تھا میں نے ماما کو بتایا دیا تھا کہ فیضان کو کوئی اعتراض نہیں۔ رومی سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہی تھی میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا دو پہر کو بیٹا نے مجھے بتایا تھا کہ حسان کے والدین شام کو آرہے ہیں وہ بہت حیران تھیں اور انہوں نے بھی ہر طرح سے سوال کر کے اپنی تسلی کی تھی۔

”ہم تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے پیار کیا تھا اور پھر جیسا میں نے چاہا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔ چا نے حسان کا پر پوزل قبول کر لیا تھا۔
رومی بہت حیران تھی۔

”یہ کیا سوئی تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ بہت خراب ہوتم۔۔۔۔۔ یعنی تم اور حسان بھائی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم فیضان بھائی سے۔۔۔۔۔“ وہ مجھے کے مار رہی تھی میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بہت محبت سے اسے دیکھا۔

”میں اور فیضان نہیں۔۔۔۔۔ تم اور فیضان، ماموں جان جلد آرہے ہیں۔“
اس کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے تھے۔

اس نے ٹکلوں ہوتے رخساروں کے ساتھ اپنے ہاتھ چمڑا لیے تھے تب ہی میرا فون بج اٹھا دوسری طرف حسان تھا۔

”سنو میں سوچ رہا ہوں چپا سے کہوں، جانی کے بجائے ڈائریکٹ رخصتی کروالیں تاکہ جب کبھی آدمی رات کو تمہیں میری ضرورت پڑے تو بس ذرا سا کندھا ہلا دیتا۔“

”بکومت“

”شرم کرو اپنے ہونے والے مجازی خدا کو یہ کہہ رہی ہو۔“

حسان شوخ ہو رہا تھا اور میری کبھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہوں رومی شرارت سے مجھے کچھ رہی تھی۔

”سنو آج شام چلو گی میرے ساتھ مقبرہ جہانگیر۔“

”نہیں۔“ میں نے فوراً انکار کر دیا۔

”بدا پرانا خواب ہے یا۔“ وہ شرارت پر آمادہ تھا۔

”حسان تمہاری وہ مرید کے والی زمین ہے نا ابھی۔“

مجھے اس کا ایک اور خواب یاد آیا جو میری خاطر اس نے اپنی آنکھوں سے نوج

پھینکا تھا۔

”ہاں لیکن اس وقت بھلا اس کا کیا ذکر۔“

”ہم اس پر ہاسپٹل بنائیں گے نفسیاتی مریضوں کا اور اس کا نام شہر محبت رکھیں گے۔“

”پاگل ہوتم!“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”پتا ہے میرے ڈیڈ نے کوئی پندرہ بار تمہارے چپا سے کہا تھا کہ یہ تالائق اتنے اچھے نمبر لے کر بھی میڈیکل میں نہیں گیا ضد نہ کرتا تو آج سرجن ہوتا اور کوئی پندرہ بار ہی ماما نے انہیں کہنی ماری تھی۔ سچی میں تو ڈری رہا تھا کہ کہیں تمہارا سہ پیا اتنی بار میرے لیے لفظ تالائق سن کر انکار ہی نہ کر دیں لیکن خیر ہوئی وہ ہنستے رہے اور تم ہاسپٹل بنانے کی بات کر رہی ہو۔۔۔۔۔ میرے ڈیڈ۔۔۔۔۔

”یہ ہاسپٹل ضرور بنے گا حسان اور ہم اس کا نام ”شہر محبت“ رکھیں گے مرید کے مٹا نہ سکی کہیں اور سکی۔“

میں نے فون آف کر دیا اور رومی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ رومی کی آنکھوں کی

چمک اس کے رخساروں کی سرخی کتنی خوش کن تھی میں نے خوشی سے مغلوب ہو کر رومی کو گلے لگالیا اور کچھ دیر بعد ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ننھے بچوں کی طرح اونچا اونچا گاتے ہوئے بیا کے پورشن کی طرف جا رہے تھے۔

یہ شہر محبت ہے

اس شہر کے باسی سب

اک پھول کی پتیاں ہیں

اور اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ریان حیران کن نظروں سے ہمیں دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا اور پھر ایک دم دو قدم بڑھا کر وہ بھی میرے ہم قدم ہو گیا اور اب ہم تینوں کی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔

